

15.5.89

537
52777 ✓
119

1801

Mohd. Yousuf
Bindery M. A. Library
A. M. U., Aligarh.
Dated.....

Boqum Ma

۸۹۱۵۰
۱۱/۱۱/۲۰۰۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۵۸

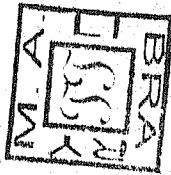
۹۴۸۳۹



۱۰۳
۲۱۹

CHL
CHECKED-2002

Tasbeer



نواب نصیر الدین احمد کی ٹہیاں میں ہوئیں خاک ہو چکیں۔ مگر ابھی ان کی آنکھیں
دیکھنے والے لوگ ہزار پانسو نہیں تو دو چار زندہ ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ مرنے والا نصیر
کس آن کا آدمی اور کس شان کا مسلمان تھا۔ دولت تھی۔ ثروت تھی۔ حکومت تھی۔
امارت تھی۔ مگر نخوت یا غور کبھی پاس آکر نہ پہنچا۔ باسٹھ سال سے اوپر عمر پائی۔ پونڈوں
کا رئیس۔ مزاج کا غنی۔ دل کا شیر۔ روپے کے ڈھیر تھے۔ دولت کی افراط تھی۔ جوہلی
مکان۔ جائداد۔ املاک۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ مگر جس سے ملا جھک کر اور جس سے
بولا ہنس کر۔ دونوں وقت لنگر عام تھا۔ جس میں مرتے دم تک فرق نہ آیا۔ غریب
غریب اپنا بچہ۔ فقیر ایک نصیر کے دسترخوان سے سیکنڈوں ہند گان خدا
پل رہے تھے۔ پھر یہ نہیں کہ کرم اور احسان۔ جس کو دیا اور جب دیا منت سے
اور خوشامد سے۔ عجز کی یہ کیفیت کہ غریب پڑوسیوں کے گھر خود جاتا اور
کھانا دیتا۔ خلق کا یہ حال کہ سائل کا سوال کبھی رد کیا نہ کرنے کا خیال آیا۔
اس دولت پر اور اس ثروت پر گرمی کے تیسوں روزے دیں ہو یا پڑیں اور
تندرست ہو یا بیمار ممکن نہیں کہ ناغہ ہوں۔ جاڑوں کی نماز فجر کر کر اتی سر دی ہو
پاچلے کے دن ناممکن تھا کہ جماعت سے نہ پڑھے۔ وہ مرحہ کا مگر نصیری مسجد
اور احمدی امام باڑہ آج تک اس کے کام اور اس کا نام روشن کر رہے ہیں۔

آدمی کیا ایک دریا اور مسلمان کیا ایک چشمہ تھا۔ جس کا فیض صبح سے شام اور خاص سے عام تک جاری تھا۔ یتیم اس کے در سے رانڈیں اس کے گھر سے۔ اپانچ اس کی دولت سے، مسکین اس کی ثروت سے زندہ تھے۔ اور خوش تھے۔ یہ تھی وجہ یہ تھا سبب اور یہ تھا باعث کہ اس کے جنازے پر بڑھوں نے پچھاڑیں کھائیں۔ جوانوں نے سر بھوڑے اور بچوں نے داویلا مچائی۔ اب یہ اتفاق سے تعبیر کرو یا تقدیر سے کہ شہر بھر کے علاج اور دنیا بھر کے جتن کر ڈالے۔ مگر بچہ نہ ہوا۔ اور بیوی بڑھیبی اسی رنج میں گھل گھل کر تمام ہوئی۔ یہ خیال کہ نصیب کی عمر اب نکاح کی نہ تھی درست نہیں۔ مرد ساٹھا اور پاٹھا۔ عورت بیسی اور کھسی۔ روپیہ تھا۔ اطمینان تھا۔ سب سے ٹکری تھی۔ خوشحالی تھی۔ پھر کیا وجہ تھی کہ غریب بقیہ عمر ٹروں ٹوں بسر کرتا۔ ہاں جس بات پر اعتراض ہو سکتا ہے وہ پوشیدہ نہیں۔ راز نہیں۔ بات کھلی اور محالہ صاف اور حق یہ ہے کہ بنائے فنا و جس نے برباد کیا یہ ہی ہے۔ نکاح کرتا۔ شوق سے کرتا ایک نہیں دو کرتا۔ چالیس کیا ساٹھ برس کی عمر میں کرتا۔ مگر بات سمجھ کر اور موقع دیکھ کر بیٹیوں کی کمی نہ تھی۔ کوارمی سے کوارمی اور بہتر سے بہتر لوگ بیٹی دیتے اور چوم چاٹ کر دیتے۔ کوارمی نہ ہوتی مانڈہ ہوتی۔ امیر نہ ہوتی۔ فقیر ہوتی۔ مگر ہڈی کی اچھی اور خون کی سچی۔ گھر کی مغلانی اور مغلانی بھی وہ جس کی ماکپڑے سینے سینے اور نانی پانی ڈھونڈتے ڈھونڈتے مری۔ شکل کی کیسی ہی اعلیٰ اور صورت کی کتنی ہی افضل کیوں نہ ہو۔ مگر حیثیت بھی ایک چیز ہے۔ نواب کی غلطی جو مغلانی سے نکاح کی صورت میں ظاہر ہوئی اتنی سنگین نہ ہو کہ اس پر الزام آ سکے۔ مگر یہ خیال بھی کچھ نہ کچھ وقعت رکھتا ہی ہے کہ اصل سے خطا نہیں کم اصل سے دفا نہیں۔ لاکھ راجا کے گھر آئی اور رانی کہلائی۔ لیکن ہم تو یہ ہی سمجھیں گے اور

سمجھتے ہیں کہ اگر نصیبِ ارضیا ط کرتا تو بسا ندی بوٹی کا گندہ شور بہ نہ ہوتا۔
اولاد کا رنج فقط بیگم صاحب کی تقدیر میں تھا اس کے بعد تو مغلانی کی
گود میں پہلے ہی سال چمکتا ہوا لال تھا۔ افسوس یہ ہے کہ نصیب کو بہار دیکھتی نصیب
نہ ہوئی۔ ضمیر چارہی سال کا تھا کہ وہ رخصت ہوئے اور اس تمام اثاثہ کی مالک
بی مغلانی ہوئیں۔

دوسرا باب

کہاں پندرہ بیس روپے ماہوار کی مغلانی اور کجا چار پانچ لاکھ روپے کا تحفہ
بلا شرکت غیرے اس کیلی کی ملکیت یا قبضہ میں تھا۔ سیر کی ہنڈیا میں سوا سیر پڑا۔
وہ بڑھ کر بولتی اور چڑھ چڑھ کر کہتی کہ سننے والے بھی دنگ رہ جاتے مغلانی
سے گھر والی ہوئی۔ گھر والی سے راج دلائی۔ جو کچھ کرنی ٹھیک اور جو کچھ نہ کرنی ٹھیک پڑا۔
اس پر ہونی اولاد اور اولاد بھی بھاری پتھر نہیں چمکدار ہیرا۔ سنانی جو چاہتی اور کہتی
جو جی میں آتا۔ مفلسی بُری بلا ہے اور غرض اس سے بدتر۔ محتاج عزیز اور غریب
رشتے دار سننے جو کہتی۔ اور اٹھاتے جو ڈالتی۔ دولت سے بڑی عیب پوش ہے
اچھی اچھی سیدانیاں اور بڑی بڑی مغل زادیاں اس کے اشارے پر آنکھیں بچھاتی۔
خدا کی شان تھی الف کے نام پہ نہ آئے۔ مگر جلسہ میں سستا آگے۔ اور کلب میں
سب سے پہلے صدرت تو اچھی تھی ہی اب لباس بھی کسی سے کم کیا بہتر ہی تھا۔ دھیم
بج گئی۔ سایہ بھی اور بوٹا بھی۔ کالر بھی اور سوٹ بھی۔ وہی وہ تھی۔ مگر وہ جو چین
کے سنے سنانے دو چار کلے اور انٹی سیدی ایکسا آدھ آیت یا دغنی اس کا بھی کبھی
نہ کبھی اثر ہو ہی جاتا تھا۔ روزانہ تو نہیں اور پنجگانہ بھی نہیں۔ مگر ماں آٹھویں سوہیں
ایکسا آدھ سجدہ بھی کر لیتی اور درود بھی پڑھ لیتی۔

ضہیر پلا اس مائے دودھ سے جو کام سے سبزا اور نام کی عاشق زار اور بہان
ایاؤں کی گود میں جو درے پر نہیں اور نماز پر کھلکھلاہیں۔ انجام ظاہر تھا۔ بڑا ہوا تو
کہنے کو مسلمان ورنہ پورا کرستان۔ روزے کا نہ نماز کا، نذر کا نہ نیاز کا۔ تعلیم کی کیفیت
پہنچی کہ پانچ چار کتابوں کے بند پھر آگے نہ بڑھا۔ منہ کا حال یہ تھا کہ بغیر انگریزی اخبار
لئے گھر سے باہر نکلنا قسم۔ امیر کا بیٹہ اللہ آمین کا بیٹہ۔ لاڈ پیار کا بیٹہ۔ کھاتے پیتوں کا
بیٹہ اس کے جہان ہونے میں کیا دیر تھی۔ چودہ برس کا لڑکا فیل کا فیل معلوم ہوتا
تھا۔ مغلانی کو بیٹے کے بیاہ کا ارادہ یوں تو مدت سے تھا۔ مگر اب تو ایک ایک گھری
ایک ایک سال تھی۔ دنیا بھر کی لڑکیاں چھان اوتھیں بھر کے گھر کنگال ڈالے۔ مگر لڑکی سمجھ
میں نہ آئی خدا خدا کر کے بی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اور ایک جگہ بات ٹھہری۔ مغلانی
روپے کی بھوک نہ تھی سمجھتی تھی اور ٹھیک جانتی تھی اور درست کہ دولت اتنی کافی اور روپیہ
اس قدر دافہ ہے کہ بھر بھر چھو بیاں اٹھاؤں اور روپے کی جگہ اشرفیاں لٹاؤں تو بھی
نچھ کو میرے بیٹے کو اور دو تین پشتوں کو روپے کا توڑانہ ہوگا۔ وہ صرف صورت کی
جوا تھی اور حق یہ ہے کہ خود بھی چونکہ حسین تھی اور اتنی کہ اس بڑھاپے یا ادھیڑ
پنے میں رائے ہو کر اور سہاگ کھو کر سو دو سو میں ایک تھی اس لئے اس کی تلاش
غلط نہ تھی۔ لڑکی جو سمجھ میں آئی وہ مغلانی کی لڑکی تو نہ تھی۔ مگر پھر بھی اچھی بہت
اچھی۔ سسرال آئی تو دبی دباؤی۔ مفلس غریب میاں کے رنگ اور ساس کے
ڈھنگ دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ مذہب تو اللہ کی عنایت سے گھر کیا محلہ بھر
میں اللہ کا نام تھا۔ ہاں زمانہ کلب کی شرکت آندھی ہوا مینہ ناغہ نہ
ہو سکتی تھی۔ مغلانی کا بہو کو اپنے رستہ پر لانا ضروری تھا۔ چنانچہ
لئے آئی۔ کچی لکڑی کا سپدہا کرنا کوئی ٹیڑھی کھیر تھی۔ اشارے کی
دیر تھی۔ بہو بھی اسی ڈگر پر پڑی۔ میاں کے دھڑے وہ کچھ کہ بغیر چھری

کانٹے کے کھانے کو ہاتھ لگانا گناہ، ساس کے شیوے یہ کچھ کہ ہندوستانی جوتی پہننے حرام۔ بہو بیچاری نے آخر کیا قصور کیا تھا۔ توڑے ہی روز میں ساس کم تھی اور بہو زیادہ۔ ہاں ایک بات تھی جو ساس کو ذرا کم مگر شوہر کو کچھ زیادہ پہنچنا ناگوار گزری اور وہ پانچوں وقت کی نماز تھی۔ بن باپ کی بچی اور مفلس ماں کی بیٹی۔ خدا مفلسوں کو بہت یاد آتا ہے۔ کوڑا پتے کے جے جمائے خیال اور میٹھے بٹھائے اثر جوانی میں اور تمول میں آسانی سے چھوٹنے والے نہ تھے۔ مزاج ہوا کہ سر پر کیا رمضان۔ مغلانی یا ضہیر کو تو غرض ہی کیا تھی کہ بھوکے رہتے اور پیاسے مرنے ضہیر تو کھلے خزانے اور ہاتھ پکارے روزے داروں پر رات دن نہنسا۔ مگر مغلانی اتنا احسان اللہ پر ضرور کرتی کہ روزے کے بدلے دو آدمیوں کو کھانا مسجد میں بھیجتی اور یہ سمجھ کر کہ روزہ صرف غریبوں ہی کے لئے ہے۔ یتیم خانہ میں بھی کچھ نہ کچھ بھیجتی رہتی۔ ایسے گھر میں اور اس قسم کے لوگوں میں رہ کر روزہ رکھنا آسان نہ تھا۔ دو تین روز تک تو دونوں ماں بیٹے خاموش رہے چوتھی سحری تھی کہ ضہیر نے ماں سے کہا۔

”یہ سحری کا عذاب تو اچھا پیچھے لگا کہ نیند بھی حرام ہو گئی۔ اول تو یوں ہی بارہ بجے سوتا ہوں اُس پر غضب یہ ہے کہ جہاں ایک دفعہ آکھ کھل گئی تو پھر نیند نصیب نہیں۔ اگر ایسا ہی روزہ ضروری ہے تو آدمی اس طرح اٹھے کہ دوسرے کی نیند برباد نہ ہو۔ دو تین روز سے یہ ہی ہو رہا ہے۔ اچھا رمضان آیا کہ سوتے ہی کے لالے پڑ گئے۔“

مال۔ ”بیٹا غریبوں کے تو خدا اور رسول الگ ہی ہوتے ہیں صفت کی تکلیفیں ان کی تقدیر میں لکھی ہوئی ہیں وہ بھگتے ہیں۔ میں نے تو پر سوں بھی کہہ دیا تھا کہ روزے کے بدلے دو آدمیوں کو کھانا مسجد میں بھیج دیا کرو۔ مگر انہوں نے نہ سنا اب ان ہی سے پوچھو میاں شاکی۔ ساس ناخوش، روزے سے فائدہ

کیا اور حاصل کیا؟

ضمیمہ۔ موٹی سی بات ہے کہ اُس وقت مسلمانوں کی حالت ہی ایسی تھی کہ پیٹ کو ٹکڑا تھا نہ تن کو چٹھڑا، ایک رمضان پر ہی کیا منحصر تھا۔ یوں ہی بارہ مہینے کے فاسے تھے۔ اس وقت کی ضرورتیں اور نہیں اس وقت کی حالتیں اور ہیں۔ مگر خدا بھلا کرے ان مفلس جاہلوں کا کہ اب تک وہی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔

مال۔ تم اندر کی سہری میں جاسو وکل سے کچھ اور انتظام کروں گی۔

ضمیمہ دہن جس کا اصلی نام ساجدؔ تھا اس لائق تو تھی ہی نہیں کہ میاں یاساس سے بحث کرتی۔ اول تو یہی، اب پر نئی دہن اور سونے پر سہاگہ افلاں دل ہی دل میں گڑھی جا رہی تھی۔ یہ وقت تو کٹ گیا اور دن گذر کر رات بھی آئی۔ مگر اس نیک بخت نے پھر سحری کا نام نہ لیا۔ دھیرے لے لے کے آواز کان میں آئی اور چہروں کی طرح اٹھ پانی پی کھلی کر پڑ رہی وہ بھی اگر آنکھ کھل گئی۔ نہیں تو اول ہی شام نیت کی اور لیٹ گئی۔ آدمیوں کی ماشاء اللہ گھر میں گئی تھی۔ چار پانچ مائیں۔ پانچ چھ رشتہ دار۔ مغلانی، ضمیمہ، ساجدؔ خاصے چودہ پندرہ مسلمان ایک گھر میں تھے۔ مگر سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے اور ایک ہی خیال میں ڈوبے ہوئے۔ روپیہ کی نحوست دونوں ماں بیوں پر کچھ اس قدر چھا گئی تھی کہ موت یا آخرت کا کبھی بھول کر بھی تو خیال نہ آتا تھا۔

روڑے کیا ٹکنے والے اور رمضان کیا رہنے والا تھا۔ آنکھ بند کر کے نکلے اور بات کرنے گذرے۔ عید۔ پر آپرچی۔ اب البتہ مغلانی کا گھر مسلمان کا گھر تھا۔ مکان میں سفیدی ہوئی۔ زیوریں ڈورے پڑے۔ گارڈیاں پر رنگ پھرا۔ کپڑا آیا۔ جوتیاں آئیں۔ غرض عید کی دھوم دھام میں مغلانی خاص اور عام سب پر سیت لے گئی۔ اس مسرت میں شریک نورسار گھر ہی تھا۔

مگر ساجدؑ کے چہرے سے جو حقیقی مسرت ٹپک رہی تھی۔ اس کا پتہ دوسری جگہ نہ تھا۔ اس کی خوشی کپڑے کی تھی نہ لٹے کی۔ کہنے کی تھی نہ پاتے کی۔ اس کی خوشی ادائیگی و فخر کا تخیل تھا جس کی برابری ان فانی اشیاء میں ایک بھی نہ کر سکتا تھا۔ اس کا صرف یہ اندیشہ تھا کہ خدا میرے روزے قبول کرے۔ اس کو روزہ بی مغلائی کی تمام جائز و حرام تھی۔ ہلال عید لے اپنا رخ دکھا کر رمضان المبارک کو وداع کیا۔ ساجدؑ کو شے پر تھی۔ چاند دیکھا اور دعا مانگی۔

”الہ العالمین مجھ گنہگار کنیز کے گناہ معاف کیجو۔ یہ مبارک مہینہ، برکت کے دن، رحمت کی راتیں ختم ہوئیں۔ مگر تیری نعمتیں موجود ہیں۔ اپنے فضل و کرم سے اپنے عطا و رحم سے میرے روزے قبول کر عذاب قبر سے محفوظ اور میرا سہاگ قائم رکھ۔“

دعا مانگ کر ساجدؑ نیچے آئی۔ دوپٹہ سنبھال کر اڑھا اور ساس کو جھٹک کر سلام کیا۔ اس کا دل ایسی مسرت سے لبریز تھا جس میں خوشی کا بحر بے پایاں لہریں لے رہا تھا۔ رات ختم ہوئی اور مؤذن نے روزِ عید کی آمد کا فزہ پہنچایا۔ ساجدؑ نے وضو کیا نماز پڑھی۔ ضمیر نے غسل کیا کپڑے بدلے و محلاتی نے کنگھی کی جوڑہ پہنا اور عید کے جلسے ہونے لگے۔ دن بھر وہ گہما گہمی اور جھل جھل رہی کہ کان پڑھی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ منوں مٹھائی الخاروں ترکاریاں سیروں دودھ اور تولیوں عطر صبح سے شام تک ہاتھوں سے اُٹھے۔ دن بھر ڈوبوں اور گاڑیوں کا تاتا لگا رہا۔

روزِ عید میں کون سے لال لگے تھے کہ سال دو سال کا ہو جاتا۔ وہی بارہ گھنٹے کا دن اور بارہ گھنٹے کی رات۔ دن کے ختم ہوتے ہی مردانے میں ناچ اور گھر میں گانا بجانا شروع ہوا۔ باہر انعام و اکرام ملے اور اندر سیل۔ ادھی رات تک

جو بہتر امت

۸
یہ ہی دھوم دھام رہی۔ مخلدنی دن بھر کی ٹھکی ماری مسہری میں جا کر لیٹی۔ آنکھیں بند کیں اور سو سونے کی تیاری، ٹخنے پر ٹپ ٹپ آنسو گرنے شروع ہوئے۔ دیکھتی ہے تو رشتہ کی خالہ زاد بہن بسم اللہ جو اوپر کا کام کرتی تھی۔ پاؤں دبا رہی ہے اور رو رہی ہے۔ پوچھا کیا ہے؟ نہ معلوم تسکین کا نتیجہ تھا یا دل کی کیفیت۔ طبیعت اور زیادہ بگڑ گئی کوشش کی کہ چھپاؤں قصہ کیا کہ ضبط کروں۔ مگر ناکام رہی۔ اتنے عرصہ میں مخلدنی تین چار بار اصرار کر چکی تھی۔ جب اُچکار کر دریافت کیا تو کہنے لگی۔
”کیا عرض کروں۔ آپ آرام فرمائیے۔“

مخلدنی۔ ”آخر کہہ تو سہی معاملہ کیا ہے؟“
بسم اللہ۔ ”کچھ نہیں آپا یوں ہی خیال آگیا۔“
مخلدنی۔ ”آخر وہ ایسا کیا خیال ہے؟“
بسم اللہ۔ ”آپ آرام کیجئے اب نہ روؤں گی۔“
مخلدنی۔ ”مگر بتانے میں کیا قباحت ہے کسی نے کچھ کہہ دیا۔“
بسم اللہ۔ ”جی نہیں۔“

مخلدنی۔ ”تو پھر یہ اس وقت رونے کا کیا سبب؟“

بسم اللہ۔

مخلدنی۔ ”بتا میں پوچھ کر رہوں گی۔ بتا کیا ہوا؟“

بسم اللہ۔ ”میں دن بھر خدا کی قدرت دیکھتی اور اپنی حالت پر غور کرتی

رہی مجھ سے بڑھ کر کم بخت شاید دنیا میں کوئی بھی نہ ہوگا۔ سات بیٹے سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مگر کوئی دن اور رات ایسی نہیں جاتی کہ جو بات آنکھوں کے سامنے ہے۔ جو کانٹا دل میں کھٹک رہا ہے اس کو فراموش کر سکوں۔ کھاتی ہوں۔ پیتی ہوں۔ منہستی ہوں۔ بولتی ہوں۔ دنیا کے سب کام اور

زندگی کی ہر ضرورت پوری کر رہی ہوں۔ بھوک مجھے لگتی ہے۔ پیاس مجھے معلوم ہوتی ہے۔ نیند مجھے آتی ہے۔ جاڑوں میں گرم کپڑے گرمی میں ٹھنڈا پانی کو نسا کام ہے جو میں نے چھوڑ دیا۔ مگر دل کی وہ کلی جو آج ہی کے روز اسی وقت مرجھا گئی۔ اب نہیں کھل سکتی۔ وہ صورت جس کو موت نے مجھ سے چھین کر ہی گور سُلا دیا۔ میری آنکھ سے جدا نہیں ہو سکتی میرا شوہر میرے سر کا دار و شف میری زندگی کا سہارا زیادہ دن نہیں، چند گھنٹے بیمار رہ کر اسی عید کی آدھی رات کو میری زندگی برباد کر گیا۔

عید کا وہ دن جس خوشی سے بسر ہوا اب میسر آنے والا نہیں۔ اور رات کو جو ستم ٹوٹا۔ وہ دل سے جانے والا نہیں۔ شام کے وقت جب دل زیادہ تڑپا تو آپ سے تنخواہ مانگی۔ کہ میں بھی قبرستان جا کر اپنی عید منا لوں اور اس صورت کے بدلے اس خاک کے ڈھیر کو سلام عید کر لوں۔ آپ نے اس وقت کچھ نہ دیا۔ میں یوں ہی چلی گئی۔ رستے میں خیال آیا کہ مرنے والا دنیا بھر کے عیش کرا گیس اچھے سے اچھا پہنایا اور بہتر سے بہتر کھلایا آج تو اس کی قبر جس طرح بنے ہواؤں۔ برس کا برس دن دنیا عید کی خوشیاں منا رہی ہے۔ کانوں کی بالیاں اسی کا صدقہ اور اسی کا طفیل ہے۔ جب وہ نہیں تو یہ رہ کر کیا کریں گی۔ ان کو بیچ کچھ ریاں اور مٹھائی لیکر قبر پر پہنچیں۔ سینکڑوں مانی کے لال۔ بوڑھے بھی اور بچے بھی اور جوان شیر ہزاروں من مٹی کے بیچے دیے پڑے تھے۔ تھوڑی سی فقیریاں کچھ پانچ اور معصوم بچے کھیلنے پھرتے تھے ان کو کھلایا اپنے ہاتھ سے پانی لائی اور پلایا اور دعا کی۔ کہ اس کا ثواب اس مرنے والے کی رُوح کو پہنچے۔ ٹھٹھا ہو رہا تھا کہ ملاجی نے اذان دی۔ دل نہ مانتا تھا اس خیال سے کہ آپ ناخوش ہوں گی۔ چلی آئی مگر میرا دل وہیں پڑا ہوا ہے اور وہی رہ رہ کر یاد آ رہے ہیں۔

آپا گھٹنے نے ابھی بارہ بجائے ہیں۔ آدمی رات کا یہی وقت تھا جب مرنے والا میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہا تھا اُس نے مجھ کو قریب بلا کر میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ لٹکین دی اور خدا کے سپرد کیا۔ میں جانتی ہوں کہ وہ مرچکا اب رونا دھونا بیکار ہے۔ مگر دل کا علاج کیا کروں کہ یہ کم بخت اسکی صودرت کو نہیں بھولتا۔ آپا آج ہی کے اُس کا انتقال ہوا تھا۔ اب وہ مجھے کبھی نظر نہ آئے گا۔ مگر آنکھوں کا کیا کروں کہ یہ کسی طرح سے نہیں تھمتیں۔“

اتنا کہہ کر بس سدا اللہ کی طبیعت بگڑ گئی اور وہ روتی ہوئی کمرہ سے باہر نکلی۔ ادھر اخلاقی خاموش تھی اور گھنٹہ بتا رہا تھا کہ رفتارِ عمر کس طرح طے ہوئی۔ شمع کہہ رہی تھی کہ رات سحر ہونے والی ہے۔ سوچنے لگی کہ یہ بچا رسی بس سدا اللہ میرا ہاتھ نکلنے والی۔ اس طرح بادشاہ میریں تڑپے اور میں جو ہزاروں صرف کروں کبھی بھول کر اس کا دھیان نہ کروں جس کی بدولت بیٹھی راج کر رہی ہوں۔ اس خیال کا انا تھا کہ مروجہ کی تصدیق آنکھ کے سامنے پھر می۔ اور موت کی خوفناک گھڑی سامنے آئی۔ سوچنے لگی کہ موت بہر حال آئی اور یہاں سے جانا مگر وہاں جا کر کیا کروں گی یہ تمام عیش آرام یہ سب جلوے جیسے زندگی تک کے ہیں یہاں کی تمام ضرورتیں خوب پوری ہوئیں نفیس سے نفیس کپڑے اعلیٰ سے اعلیٰ زیور قیمتی سے قیمتی بچھونا۔ افضل سے افضل کھانا۔ لیکن کوئی دن کیا کوئی گھڑی ایسی نہ گذری کہ وہاں کی ضرورتوں کا بھی خیال آتا اور سمجھتی کہ ایک روز اس زبردست بادشاہ کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ جس کی حکومت ابدی اور میں کا راج مستقل میری صاحبی عارضی میری خوشیاں فانی۔ اور میری امارت پانی کا بلبلہ دریا کی ریست اور دودھ کا چھگا! ان ہی خیالات میں غرقاب اور تفکرات میں لپٹی کچھ دیر پڑی رہی

چاہا بہت کہ نیند آئے۔ مگر نہ آئی۔ مجبوراً اٹھی اور سر پہلی اور ہر پہلی۔ بڑی دافوفہ کو بلا کر حکم دیا قصہ سننا و قصہ سنتی رہی۔ مگر نیند کسی عنوان آئی تھی اور نہ آئی دوسری دافوفہ سے کہا کتاب پڑھو۔

کتاب خواں۔ شروع سے کوئی کتاب پڑھوں۔

مغلانی۔ "نہیں یہ لو۔ یہاں سے پڑھو۔"

کتاب خواں۔ "جذبت کی دھتیا اور مغرب کی رسیا کلب کے جلسہ

سے لڑتی تھی گرمی کا موسم تھا آفتاب غروب ہو چکا تھا اور ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے فرحت بخش آرہے تھے۔ گاڑی ساتھ تھی۔ حکم دیا کہ گھر جاؤ۔ خود پیرل چلنے لگی۔ وقت سہانا تھا۔ اور ہوا سرد و دُر ٹھل گئی اور ایسی سڑک پر جا پہنچی۔ جہ پچھلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ چاروں طرف بھٹکتی پھری مگر کہیں رستہ نہ ملا۔ یہاں تک کہ رات نے سیاہی کا برقع روئے زمین کو اڑا دیا اور جنگل میں سناٹا چھا گیا۔ ہر طرف نگاہ دوڑائی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مگر آدمی نہ آدم زاد۔ دل ہوا ہوا کیلچہ دھکڑ دھکڑ کرنے لگا۔ ہوا کے فرائوں کے سوا اس اندھیرے گھپ میں اور کوئی آواز نہ تھی۔ چینی چٹائی دوڑی۔ لپکی۔ حیران پریشان ٹھہری بڑھی۔ مگر بے سود اور بیکار خوف کے مارے اور دشت کے سبب دم ٹکل رہا تھا اور رُوح فنا ہو رہی تھی، آسمان کے تارے بھی ٹھٹھے لگا کر روپوش ہوئے اور سیاہ گھٹانے ڈیرے ڈالے وقفہ اولوں

کی بوچھاڑ شروع ہوئی اور سفید چادر بیابان کے ہر چہ میں کچھ گئی۔ بادل کڑک رہے تھے مگر بجلی مطلق نہ تھی۔ او لے پڑ رہے تھے۔ لیکن میٹھ بہت ہلکا تھا۔ بوندیاں تھیں مگر کم، جس کی پھلی عمر اس طرح بسر ہوئی کہ رنج خواب میں اور تکلیف بھول کر بھی پاس آکر نہ بھٹکی اس پر جو کچھ گذرتی وہ بیان سے باہر ہے۔ سنا تھی۔ خاموش تھی۔ سہمی ہوئی۔ ڈری ہوئی۔ لہزہ رہی تھی۔ تھرا رہی تھی۔ گہرائی ہوئی۔

سٹ پٹائی ہوئی۔ کبھی ادھر سے ادھر بھاگتی اور کبھی ایک جگہ کھڑی ہو جاتی۔ مگر
 لمینان کی کوئی صورت پناہ کی کوئی جگہ میسر آئی نہ نصیب ہوئی۔ ریڈر چیخے۔
 لنگور چلائے۔ سانپوں کی پھینکا رہتی۔ اولوں کی بھرمار تھی۔ چٹائیں تھیں۔ پہاڑ
 تھے۔ راکھ کے ڈھیر تھے۔ خاک کے انبار تھے۔ اس جدت کی شدید ایگم کو یقین ہو گیا
 کہ دم نکلا اور جان چلی۔ یہ قیامت خیز سماں یہ مصیبت انگیز وقت خدا دشمن کو بھی
 نہ دکھائے۔ ستائے کا میدان اور ہوا کا عالم تھا۔ رستہ بتانا تو درکنار کوئی
 بات تک کرنے والا نہ تھا۔ کپڑے چوڑا، بدن شور بہ شور ایک درخت کے نیچے
 بیٹھ کر رونے لگی۔ خدا خدا کر کے سامنے سے روشنی نمودار ہوئی اور ایسا معلوم ہوا
 کہ منہ والا شہر ہاتھ میں چراغ لئے رو برو کھڑا ہے۔ کپڑے سپید براق۔ لگی چھین مارنے
 لگے ہوتا کیا تھا اور سنتا کون تھا بدن میں رعشہ ہاتھ پاؤں میں کپکپی، چاہتی تھی زمین
 میں دھنس جاؤں درخت میں گھس جاؤں کہ مرنے سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور کہا:-

رمضان کا مبارک مہینہ آئے اور نکل جائے فرشتے اور انسان
 اس کے فراق پر آنسو گرائیں اور تجھ کو تیرے گھر والوں کو غیرت
 تک نہ ہو۔ خدا کے نیک بندے اپنے محبوب کے حکم کی تعمیل میں
 بسیک کہیں اور توان پر خفا ہو۔ ایک نیک لڑکی ایک مسلمان
 عورت تجھ جیسی ناہنجار اور جفا شعار کے قبضہ میں پھنس کر سحری و
 افطار سے محروم ہو۔ مسلمان کا گھر اور سحری گناہ۔ مظلوم تیرے
 ظلم سے اور محکوم تیرے حکم سے دو گھونٹ پانی کے پی کر روزہ
 رکھے۔ تو ڈسٹ ڈسٹ کر کھائے اور تن تن کر پیئے۔ اور روزہ دار
 بارہ تیرہ گھنٹے کا پہاڑ سا دن گزار کر بھی پانی سے افطار کرے
 افسوس تیری حالت پر اور شرم تیری صورت پر!!

بدبخت! وہ وقت زیادہ دُور نہیں جو بتا دے گا کہ جس کو اپنا
سمجھا وہ غیر تھا۔ اور جس کو غیر جانا وہ اپنا تھا۔

مغلانی شروع ہی کی سطر میں سُنیے پائی تھی کہ اس کی آنکھوں میں عمر گذشتہ
اور حالت موجودہ کا تمام نقشہ پھر گیا اور ایسا معلوم ہوا کہ خود اسی کی تاریخ کوئی مختصر
لکھ رہا ہے۔ پسمر اللہ ہی کی مصیبت نے اس کی طبیعت خراب کر دی تھی۔ کتنا پیٹ
باکل ہی بے قابو کر دیا اور یہ حالت ہو گئی کہ گویا نصیبِ اس کی بر باد ہی کی داستان
بیان کر رہا ہے۔ سُنیے ہی بری کی طرح فقر فقر کا پیٹنے لگی۔ سب کو ہٹا دیا بہت
دیر تکا روتی رہی۔ اب نیند کہاں۔ کھڑی ہوئی اور صحن میں آئی تو پوچھ پٹ رہی تھی۔
اور یہ سماں بجائے خود اس قدر مؤثر تھا کہ ہر شے پر جو آنکھ کے سامنے تھی فنا کا جلوہ
برس رہا تھا اور رخصت ہوتی ہوئی رات جو مریض کی طرح دم توڑ رہی تھی آئے
والے ہماں سے گلے بل بل کر بے ثباتی دنیا کے نرسے لگا رہی تھی۔ اس منظر نے
یقین دلایا کہ موت سر پر آپہنچی۔ ندامت کے آنسوؤں سے روتی ہوئی نماز کو کھڑی
ہوئی۔

تیسرا باب

بھلے گھوڑے کو ایک چابک، بھلے آدمی کو ایک بات! مغلانی اگر آدمی ہوتی
اور آدمی بھی سمجھدار تو پسمر اللہ کی داستان اور کتاب کا بیان دونوں عمارت
زندگی کی ان بنیادوں کے واسطے جو کمزور ہو چکی تھیں ارادہ کا کام دیتے اور
ڈنگلاتا ہوا ایمان پہاڑ کی طرح مضبوط ہو جاتا۔ مرحاتی اور اس سبق کو نہ بھولتی۔
کھوئی ہوئی دولت اور گئی ہوئی نعمت خدا نے گھر بیٹھے بھیجی۔ مگر طبیعت میں شرافت
ہوتی اور اعلیت سے بے خبر نہ ہوتی تو یہ فہم نہ ہی کیوں آتی۔ دو چار دن تو شیخ
بھی کھٹا کھٹا رہی اور نماز بھی جھپا جھپ۔ مگر ادھر تو لڑائی عقل اوہر گزرا وقت

وہ ڈر رہا نہ خوف نماز تو خیر گنڈے دار ہوئی مگر شیخ کا جوش پندرہ دن بھی نہ رہا۔ اور آخر کار دونوں القط۔ وہی دنیا اور دنیا کے دھندے، وہی کلب اور کلب کے چندے۔ اس گود کی اور اس دودھ کی ایسی ماں کی اور ایسی عورت کی اولاد جیسی اگھٹی ظاہر ہے۔ ضعیف آغاز شباب ہی میں عذابِ ثواب کا قائل نہ تھا اور اتنا مسلمان تھا کہ بیوی کی سحری اپنی نیند پر قربان کر دی۔ پورا جوان ہوا تو عمر کے ساتھ ہی ساتھ لاندہ ہی میں بھی ترقی کرنا لگیا۔ غصہ اس پر اتنا ہے کہ پڑھا نہیں لکھا نہیں مگر مشکل سے مشکل مسئلے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مرحلے میں رائے دینے کو موجود اور صلاح دینے کو تیار۔ حدیث۔ قرآن۔ فقہ۔ منطق کوئی بحث ایسی نہ تھی جس میں وہ بند اور کوئی گفتگو ایسی نہ تھی جس میں وہ خاموش۔ مگر بڑی خرابی آکر یہ پڑی کہ میاں بیوی کے مزاج میں آسمان زمین کا فرق تھا۔ ساجد اول اول تو میاں اور ساس کے رنگ دیکھ کر اسی طرف ڈھل گئی تھی۔ بلکان سے بھی دو قدم آگے مگر ٹیکے میں ایک روز وعظ تھا وہاں جو مولوی صاحب کی تقریر سنیں تو لرز گئی اور عہد کر لیا کہ حیاں رہے یا جائے اور گھر بگڑے یا سنورے میں اس ترقی کی طرف قدم نہ اٹھاؤں گی۔ جو درحقیقت تنزل کا پوشیدہ ماز ہے۔ وعظ تو معمولی تھا مگر خاتمہ کے الفاظ جو ساجد کے دل میں گر گئے یہ تھے۔

”جو یوں اگر وہ پہلی آواز جو فانی دنیا نے کان میں پہنچا کر ایک زبردست طاقت کا اعلان کیا یا دہو تو صداقت کے کانوں سے سنو اور انصاف کی نظر اس شجرِ حیات پر ڈالو۔“

اس درخت پر رنگ برنگ کے طائر اپنی اپنی بولیاں بول گئے اور ایسے ایسے نغمے گانگئے کہ اب تک ان کا رس کانوں میں موجود ہے۔ ان کا قیام ایک رات کا بسیرا تھا۔ وہ اذان مغرب

کے ساتھ ان ڈالپوں پر چپکے اور نماز فجر سے قبل رخصت ہو گئے
 اگر پانی کے وہ چند قطرے جو سب پہلے جسدِ خاکی پر پڑے اور جن کی تہ
 میں غسلِ آخرینہاں تھا۔ فراموش نہ ہوئے ہوں تو شوق کے قدم بڑھاؤ
 ایمان کی آنکھیں کھولو اور دیکھو اس چمنستانِ زندگی میں ایسے ایسے
 گلہائے رنگیں کھلے ہیں۔ جن کی خوشبو نے ایک دنیا کو ہکا دیا۔
 ان کا عرصہ حیات صرف ایک رات تھی۔ غروبِ آفتاب نے ان
 کو زندہ کیا۔ اور صبا کی سرسراہٹ سے پہلے مرجھا گئے۔ اب وہ طائر
 ہیں نہ پھول۔ مگر ان مسافروں کے نقش پا ابھی موجود ہیں۔ ان کے
 کارنامے ماہِ کامل کی طرح روشن اور آبِ زلال کی طرح صاف
 ہیں۔ آؤ باغیچے فانی کے ان سرسبز و شاداب پردوں پر نظر ڈالیں۔
 جنہوں نے عورت کی ہستی میں ظہور کیا۔ آج بھی وہی چہرے ہیں۔
 وہی صورتیں وہی کھڑے ہیں وہی موڑیں۔ مگر ان چہروں پر وہ
 نورِ ان پھولوں میں وہ خوشبو، ان پردوں میں وہ طراوت نہیں
 جو آج سے نصف صدی پیشتر تھی۔ ان قدموں پر قدم رکھو۔ پتہ
 ڈھونڈو اور سراغ لگاؤ۔ کوشش اس جگہ پہنچا دے گی۔ جہاں
 تلاش کی آنکھیں تماشے دیکھیں گی۔ جن کے ساتھ ہی شانِ اسلام
 کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ صورتیں دیکھو گے جن کی رگ رگ سے وہ
 گھر دیکھو گے جن کے چہرے چہرے سے اسلام کی صدائیں بلند ہوں گی۔ مگر
 دلی بھر کر دیکھنا، جی بھر کر ٹھہرنا اور پیٹ بھر کر دیکھ لینا آنکھیں ان
 صورتوں کو جی ان باتوں کو۔ دلی ان معاملات کو اور نگاہیں ان
 نیایات کو ترسیں گی اور ناکام نہ ہوں گی، اور بے سود نہ ہو

عورتیں ہیں جن کے سفید بال منات کی کنگھی سے آراستہ اور
جن کے خلوص بھرے دل صداقت کے پھولوں سے مزین
ہیں ان کے سروں پر جالی کے ڈوپٹے احمد آبادی اور گجراتی
بیلوں سے مزین نہ ہوں۔ مگر ان کی موٹی چادریں لٹھے اور زین سکھ
کی دھریں خوفِ خدا کے بیشش ہاتھوں اور گجروں سے ہبک
رہی ہیں۔ یہاں مذہبِ زبان سے کہنے اور قلم سے لکھنے کو
نہیں ہے، جھومر کی لٹپوں میں، کالا کے ڈوروں میں دھک رہا
ہے، بھالوں میں، اور بالوں میں، چھٹیوں میں اور چالوں میں حیا
ان کا زیور ہے، شرم ان کا لباس، ادب ان کا جہر ہے اور
رحم ان کا شہید، دیکھو سامنے دیکھو اور اس خاتون پر نظر ڈالو
یہ بال کامیابی حیات کا سہرا باندھ کر سفید ہوئے ہیں۔ یہ آنکھیں
گھڑیوں خوفِ خدا سے روئی ہیں اور یہ پیشانی گھنٹوں سجدے
میں رہی ہے یہ مفلس اور فقیر نہیں، وہ ہے جس کے ہاتھ سے
ہزاروں لاکھوں روپیہ عمر بھرا کٹھا اور اب بھی ایک محفلِ خاندان
اور پورے گھرانے پر حکومت کر رہی ہے۔ یہ لڑاسوں کی نانی
اور پوتلی کی دادی ہی نہیں نوکروں کی آقا اور لونڈیوں کی
الک بھی ہے۔ اقبال کے سایہ میں جوانی بڑھاپے سے بدلی،
اور آج خلق کی زنجیر اس پوسیدہ گھر اور تنگ مکان میں گھسیٹ
کر لائی ہے۔ چھوٹے لڑکے کا بیاہ ہے اور مفلس بھانجی کو بلاوا
دینے خود آئی ہے!! اس منہ سے باتیں نہیں پھول جھڑ رہے ہیں یہ
پھول رہنے والے نہیں۔ اپنے دامن بھرو۔ زمانہ بہشت جلد چن اسلام کو

ان جوہروں سے محروم کرنے والا ہے۔ یہ واقعات فساد اور معاملات خیاب و خیال ہو جائیں گے۔ صداقت کی شہادت پیش نظر رکھ کر ایمان کی ترازو ہاتھ میں لے کر فیصلہ کرنا اور بتانا کہ کیا نکتہ اور کیا ہو گیا۔ نو دیکھو!

اے ہے مریم! قربان کی تنہی پیک۔ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ایک کیا چارکروں کی بھجڑتی۔ اس مردار نے مجھ سے ذکر ہی نہیں کیا۔
 ہر حکم۔ ”خالد اماں پیک کا کیا ہے۔ یہ تو میں نے ایک بات یوں ہی کہہ دی
 اللہ آپ کو شادی ریحانی نصیب کرے۔ میں تو بڑی خوشی سے چلتی۔ مگر ادھر
 تو بچوں کو دیکھ لیجئے اس کی آنکھیں دکھ رہی ہیں، اُس کے گانگن نکل رہی ہے
 ادھر ان کے اپنے کھانے پینے کا کچھ انتظام نہیں۔ خدا نے چاہا تو کسی چالے
 میں آکر شریک ہو جاؤں گی۔“

حالا۔ ”بٹی کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہے بچے اچھے نہیں ہیں تو وہ بھی
 تو اپنا ہی گھر ہے۔ کسی غیر کا نہیں۔ جو ضرورت ہو گی انتظام ہو جائے گا۔ میاں کی
 تم نے خوب کہی۔ بیلیاں بیٹے جاتی ہیں تو کیا دامادوں کے کھانے کا الگ انتظام
 ہوتا ہے۔ کیا ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ گھر والی کے آنے سے مرد کو کیسی تکلیف ہوتی ہے۔
 یہ بھی کہیں دنیا میں ہوا ہے کہ بیٹی کو تو بلا لیا اور داماد کو بھول گئے۔ پہلے کھانا ان کا
 پیچھے تمہارا۔ جو ہٹنی روٹی اللہ دے گا۔ پہلے ان کو پہنچ جائیگا۔ پھر تمہارے آگے
 رکھیں گے بلا اور حقیقت ان ہی کا ہے مگرے تم کو جا رہی ہوں ابھی تو زمانے اتنی
 ترقی نہیں کی کہ بیٹیوں سے واسطہ رکھیں اور دامادوں کے آرام سے غافل ہو جائیں۔“
 بیٹی تمہارا چلنا ضروری ہے۔ اور تمہاری شہرکت لازمی ہے۔ کیا
 میرے دل میں وہم نہ آئے گا کہ سگی ماں جانی جہاں آرا کی بچی شہر کے شہر میں موجود ہو اور

دوہا کے سر پر آنچل نہ ڈالے۔ میری آنکھیں تو آج تین دن سے جہاں آرا کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ وہ زندہ ہوتی تو بھانجے کو دوہا دیکھ کر کتنی خوش ہوتی۔

ہرچم۔ ”یہ تو آپ درست فرماتی ہیں۔ مگر میری حالت کو بھی تو دیکھئے پھر کہنا پاتا تو تقدیر کا ہے شکوہ نہیں۔ مگر کپڑے تو ڈھنگ کے ہوں۔ کچھ ایسی آکر پڑی ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتی آپ بڑی ہیں مگر بھائی تو چھوٹا ہے اس وقت تو آپ محاف کجے پھر دیکھی جائے گی۔“

خالہ۔ ”لو کی تیری عقل کو کیا ہو گیا۔ امیر غریب ایک ہی تھان کے ٹکڑے ایک ہی قبیلے کے چٹے بٹے ہیں۔ پتے کیسے ہی ہو جائیں۔ کوئی سبز ہے۔ کوئی زرد۔ مگر جڑ تو ایک ہی ہے۔ میں نے دھوپ میں بال سفید نہیں کئے۔ کپڑے اور گہنا لے آئی ہوں۔ تم منہ ہاتھ دھوؤ۔ کنگھی چوٹی کرو۔ بچوں کو نہلا دو۔ ان کے کپڑے بھی موجود ہیں۔ گاڑی تیار رکھ دی ہے۔ ہر دم جلدی کرو۔“

ہرچم۔ ”کیا عرض کروں اس وقت تو جانے ہی دیجئے میں انشا اللہ دوچار روز میں حاضر ہوں گی۔“

خالہ۔ ”واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ تم کو دم نہیں آتا کہ بھائی کے سر پر آنچل نہ ڈالو۔“

ہرچم۔ ”پھر آپ فرمائیں گی کہ ان لڑکیوں کے داغ بگڑ گئے ہیں۔ کیا آنچل ڈالنا نہایت ضروری چیز ہے۔ میں تو اس کو ایک فضول رسم سمجھتی ہوں آپ اس پر اس قدر زور کیوں دیتی ہیں؟“

خالہ۔ ”میں نے تمہیں بھی نہیں کہا۔ کہ ان لڑکیوں کے داغ بگڑ گئے ہیں یہ کہتی ہوں کہ جہنت سننے ان کی آنکھوں میں کچھ ایسی چکا چوند پیدا کر دی ہے کہ اپنے اصلی بوجھوں کو فراموش کر رہی ہیں۔ تم اس آنچل ہی کو لے لو۔ فضول کہہ رہی ہو۔“

مگر اس میں ایجاد کرنے والوں نے کچھ نہ کچھ ضرور رکھا ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آنجل اتنی ضروری چیز ہے کہ بغیر تمہارے آنجل کے نکاح ہی نہیں ہو سکتا یا تمہاری شرکت آنجل میں نہایت ضروری ہو۔ ہاں میں اس کی خوبیوں کی قائل ہوں اور یہ تمہاری غلطی ہے کہ تم اپنی قدامت کی قدر نہیں کرتے کیا تم کو اس سے انکار ہے کہ بیٹی پر ایسا دھن ہے اور وہ شوہر کی ملکیت ہے شادی کے بعد جو حق شوہر کا اس پر ہے وہ والدین کا نہیں۔

مہریم۔ "جی نہیں ہرگز انکار نہیں۔"

حالیہ۔ "بس تو جب یہ یقین ہے تو یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ داماد بیسے بھی گو موجود ہیں۔ جن پر بیٹے قربان ہیں تو آستین کے سانپ بھی ہیں۔ اور ما باپ کا اس سے زیادہ عمر میں کوئی خوشی ہوگی کہ بیٹے کا بیاہ ہو رہا ہے۔ کیا یہ ضرور نہیں ہو کہ وہ اس خوشی میں بیٹی اور داماد کو بھی شریک کریں۔ کیونکہ شرکت کو وہ کسی طرح لازمی اور ضروری تو کر ہی نہ سکتے تھے۔ ہاں یہ رسم مقرر کر دی کہ بہن بھائی کے سر پر آنجل ڈالے اور ہنوتی دو لہا بنائے۔ تاکہ داماد اس شرکت کو ہنوتی بات نہ سمجھے کچھ زور ان رسموں کا بھی پڑے اب اگر داماد کا اس شرکت میں کچھ خرچ ہو رہا ہے دُور سے آیا ہے تو اس کا نیک بھی مقرر کر دیا کہ ما باپ دیکھ کر کہ بیٹی داماد کا کیا اٹھا۔ اس رقم کو نہ صرف ادا کر دیں۔ بلکہ جیسا موقع ہو اس بہانہ سے ملو کہ کریں۔ دوسری بات اور ہے دو لہا گھر میں آیا۔ وہ دو لہا کی حیثیت سے تمہاری رائے میں ہشاش بشاش ہو گا۔ مگر ہماری رائے میں اس کی حیثیت میں شرم دھجائی ہے کہ بڑی بوڑھیلوں کے سامنے دندنا تا ہوا داخل ہو گیا۔ وہ اگر تنہا ہو گا تو اس کا حجاب اور ترقی کرے گا۔ اس لئے دروازہ ہی میں برابر کھائیں اس کی شرم میں شریک ہو کر اس کے حجاب کو دفع کر دیں۔ ایک تیسری بات اور ہے دو لہا اس سے پہلے

گھر میں نہیں آیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ دولہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کا استقبال بھی کیا جائے گھر کا رستہ بھی بتایا جائے۔ دولہن والیاں اس وقت سائے انہیں سکتیں۔ کیا یہ محقول تدبیر نہیں ہے کہ خود بہنیں ہی اس سلسلہ میں اس کام کو انجام دے لیں۔ ایک چوتھی بات اور سنو کچھ ضرورتیں ایسی پیش آئیں کہ چپکے سے کوئی بات دولہا سے کہنی ہے یا کچھ ہدایت کرنی ہے۔ کیا اس وقت کا نا پھوسی کرنا بہت ہی نہیں؟ آجکل کے ہاں سے کیا یہ ضرورت پوری نہیں ہو سکتی؟ رہی پردے کی احتیاط وہ ظاہر ہے۔ یہ ہیں تمہارے قدیم طریقے جن پر آج منہ آتی ہو۔ مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ وہ رہیں جو خود ہماری تجویز نہیں بلکہ دوسروں سے لے کر ہم نے اپنے ہاں شامل کر لیں۔ یقیناً قابل اصلاح ہیں۔ لیکن ہمارے اپنے طریقے تو سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہیں۔ اب تعلیم جو گل بھلا رہی ہے وہ ظاہر ہے۔ اس کا بڑا حصہ محض نفسانیت کی ترقی ہے۔ ابھی برسوں کی بات ہے میں تمہاری بہن کے ہاں بیٹھی تھی۔ فیمو کی ماں اتنے دنوں کی ماما تنخواہ مانگ رہی تھی بیوی دینے بیٹھیں تو چار دن کی بیماری کی تنخواہ صاف کاٹ لی۔ میں تو میرے پیٹ کی مگر میں تو دنگ رہ گئی۔ سچے سات برس کی خدمت کر نیوالی۔ چار دن بیمار ہو گئی تو یہ غضب مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں نے کہہ دیا "بیٹی یہ تو زیادتی ہے"۔ فرمائی کیا ہیں "آپ اس میں دخل نہ دیجئے تو کراہی طرح درست رہتے ہیں"۔

بھلا بیوی میں یہ باتیں کیا جانوں۔ میں نے تو ماں جان کو دیکھا ہے ان کے پاس ایک ماما تھی۔ کرم بی اس کا ایک بھتیجہ تھا فاضلو۔ باپ ڈیرہ مہینہ کا چھوڑ کر مرا کوئی دو سال کا ہو گا کہ ما بھی مر گئی۔ پھر بھی کے ساتھ رہتا تھا۔ خاصا چودہ برس کا ہو گا کوٹھے پر کھڑا کنگوا اڑا رہا تھا پاؤں پھسللا اور دو متر لے سے گر کر نیچے آیا۔ عمر تھی بیچ گیا۔ مگر ایک ٹانگ ایسی بیکار ہوئی کہ دنیا بھر کے علما جگر ڈالے اور کسی طرح آرام

نہ ہوا۔ بد نصیب کی ماتھی نہ باب ایک پھوپھی ہی پھوپھی تھی۔ اس درد سے رات بھر کراہتا کہ کچھ پرچوٹ لگتی۔ ڈیڈرھی میں پڑا رہتا تھا۔ اور کوئی اتنا نہ تھا کہ نکھی تک اُڑا دے۔ رات کے وقت کرم بی جا کر تھوڑی دیر بیٹھ جاتی مگر بھائی کی اولاد اور اپنی اولاد میں یہ فرق ہوتا ہے کہ چند روز میں اگتا گئی۔ سچ کایہ وارث تھا کہ دنیا کی کروڑوں مخلوق میں ایک زندہ رُوح ایسی نہ تھی کہ اس کی ٹانگ پر تیل کی لاش کر دے کرم بی بھی تیل جاتی اور یتیم ایک ایک کا منہ نکلتا اور تڑپتا۔ ایک رات کا ذکر کہ بارش ہو رہی تھی اور سہواً بعض کے زخموں پر چھریوں کا کام کرتی تھی۔ کوئی نو سیکے ہوئے گئے اس نے ماں جان کو بلایا وہ سانسے کا بچہ تھا۔ پردہ نہ کرتی تھیں۔ رونوں وقت کی روٹی اور دو اکو ایک پیسہ روز دیتی تھیں۔ ایک ٹسکا اُس کے سر ہانے پانی کا اور چوکی پائنتی رکھوا دی جب وہ گئیں تو فصلوں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا :-

”بیگم صاحب آج میری حالت خراب ہے۔ ہائے اب خدا کے سوا کوئی وارث نہیں۔ میرا اگر دنیا میں کوئی سہارا ہے تو آپ کی ذات۔ مجھے شام سے سر دی بہت لگ رہی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دم نکل رہا ہے پھوپھی سے دو تین دفعہ کہا۔ نہیں سنا۔ بیگم صاحب میں کانپ رہا ہوں اپنے بچوں کا صدقہ کوئی رضائی دے دیجئے۔“ ماں جان نے اکر رضائی نکالی اور اپنے ہاتھ سے جا کر اڑھائی بات گئی گزری ہوئی۔ کوئی پندرہ دن بعد کا ذکر ہے کسی بات پر چھوٹی آپا کرم بی سے خفا ہو گئیں اور بات ایسی بڑھی کہ کرم بی اپنا اختر بخر سنبھال سیدھی ہوئی۔ چھوٹی آپا اس کا تو کچھ نہ کر سکیں۔ نزولہ برضو ضعیف جھوٹل اترتی تو غریب پر گئیں اور کہا ”جاتو بھی جا۔ جب پھوپھی ہی چلی گئی تو تیرا یہاں کیا کام۔“ اب ذرا اس وقت کا خیال کر لو ایک بن مایا پ کا بچہ۔ اپنا بچہ۔ یتیم ایسا قنور گھروالی کے حکم سے اس حالت میں کہ وہ کروٹ بھی شکل سے لے سکتا ہے

نکل رہا ہے۔ تم خود ہی اندازہ کرو کس طرح چارپائی سے اُترا اور چلا ایکسا باشت چلتا ہے اور چپک کے مارے جان نکل نکل جاتی ہے۔ روتا ہے۔ چیختا ہے۔ چلاتا ہے اور پھر فہم کراگے بڑھتا ہے۔ تین چار گھنٹے میں شکل سے دس بارہ گز چلا ہو گا۔ رات چاندنی تھی اور موسم سرد برصہیب لحاف لے جا سکا نہ چادر۔ ماہتاب نے مظلوم یتیم کو آغوش میں لیا۔ دُش شے ہوں گے کہ آبا جان آئے اور آتے ہی پوچھا کہ ”فضلو کہاں ہے؟“ چھوٹی آپا نے کہا کدھری نکل گئی ہیں اُس کو بھی نکال دیا۔ وہ تو یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ بہت بُرا کیا۔ ماں جان نازعنا پڑھ رہی تھیں۔ اور اُن کی ناز کا یہ حال تھا کہ مجھے یاد نہیں اُنہوں نے نماز کے آگے کسی چیز کی پروا کی ہو۔ یہاں تک کہ تمہاری اما کے مرنے کا ناہ آیا۔ پیاری کی خبر پہلے سے تھی۔ سب گھبرا گئے۔ مگر اُنہوں نے نماز نہ چھوڑی۔ مگر یہ سنتے ہی کہ فضلو کو نکال دیا اُنہوں نے سلام پھیر کر اتنا تو کہا:-

”ہے ہے کم بخت یہ کیا ظلم کیا“

اور برقع ہاتھ میں لے ڈیوڑھی میں آئیں فضلو موڑ پر پڑا سکر رہا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہیں تو آبا جان۔ رات خاصی آگئی تھی۔ سڑک پر سناٹا تھا ان سے چارپائی پکڑوائی اس کے پاس گئیں جگایا اور چارپائی پر لٹا کر لائیں۔ آبا جان چلے آئے وہ اس کے پاس بیٹھیں۔ میں ہاں گئی۔ فضلو کی نگاہ آبا جان کے چہرے پر تھی۔ اس میں کیا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتی۔ مگر اتنا کہہ سکتی ہوں دنیا کی بیش قیمت سے بیش قیمت شے اس کی برابری نہیں کر سکتی۔

لوہی مریجہ! چلو! جلدی کرو۔ میں تم کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔
چھوڑ دوں گی نہیں۔

ہمارے قدامت فہم ہو چکی۔ غریب رشتہ داروں کا مان رکھنے والیاں

قبروں میں جا سوتیں۔ اسب انسانیست کا دور دورہ ہے۔

تقریر کا اثر تھا یا وعظ کا نتیجہ مایٹوں کے خیالات کا جو اثر ساجد پر پڑا تھا ایسا زائل ہوا کہ چھینٹا بھی نہ رہی اور ایسی حالت میں ساجد کی زندگی سنا اور میاں دونوں کے واسطے خاصی مصیبت تھی۔ میاں کی زبان سے برسوں خدا کا نام نہ نکلے بیوی قدم بھی اٹھاتی تو بسم اللہ کہہ کر۔ باوجود اس عزت اور خدمت کے جو خدا نے اس کو دی۔ وہ میاں کی محبت۔ ساس کی عنایت اور اپنی حالت کو نہ بھولی۔ کھانسی، بخار، درد، کوئی تکلیف ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ نماز ناغہ ہو جائے۔ کرکڑاٹے جاڑوں میں بیماری کی حالت میں ٹھنڈے برت پانی سے وضو منظور۔ مگر نماز کا نہ پڑھنا تو کیسا قصا پڑھنا بھی منظور نہیں۔ ضمیر نے اپنی طرف سے بہت سمجھایا۔ مگر اُس نے نماز نہ چھوڑی۔ قیاس چاہتا ہے کہ اس نماز مانی کی نماز ساجد کا کو یہ پستی کہ ضمیر اس کی صورت سے بیزار ہو جاتا اور یہ دیکھ کر کجنت اسی جہالت کا پینٹنا پیٹے جا رہی ہے۔ بات تک کرنی چھوڑ دیتا۔ مگر ایسا نہ ہوا اس سرتابی پر بھی ضمیر اس کی صورت کا دیوانہ تھا۔ اور اگر یہ نہ کہا جاسکے کہ ساجد کا خدا اس کے ساتھ تھا تو اس کہتے ہیں کیا تامل ہو گا کہ زبردہ پہن کر اور پہنٹ بھر کر فاقے اور مصیبت ہمیشہ اس کے پیش نظر رہے۔ اس نے جس طرح تکلیف کو عارضی اور اذیت کو فانی سمجھا اسی طرح راحت کو چھاول اور مسرت کو چاندنی۔ افسوس یہ ہے کہ مخلدنی دنیا کی راحتوں کو جلد ختم کر گئی۔ وہ کم سے کم یہ دیکھ لیتی کہ لاپرواہی کے جو بیج وہ گھر میں بو رہی ہے۔ یہ آئندہ نسلوں تک کو غارت کر کے بھی بچھا چھوڑنے والے نہیں کچھ ایسی بڑھیا بھی نہ تھی۔ پچاس باون برس کی عمر۔ بندھی ہوئی کاٹھی۔ گٹھا ہوا بدن۔ آدھ سیر بالائی مرتے مرتے ناغہ نہ ہوئی میرنے کی عمر تھی نہ اندیشہ نہ دیکھ نہ بیماری ٹھہری تھی۔

کلبے آئی جون کا مہینہ تھا۔ گرمی نواٹے کی پڑ رہی تھی کچھ رستے کی نیکان کچھ وقفی جس۔
 آتے ہی نہائی۔ تہا کراٹھی۔ بیٹھی باتیں کر رہی تھی کہ بخار چڑھا اور ساتھ ہی سینہ
 میں درد۔ اسی وقت ڈاکٹر لیڈی ڈاکٹر ہندوستانی ڈاکٹر گورا ڈاکٹر سب جمع
 ہو گئے۔ تین دن اور تین رات اسی طرح پڑی رہی جو تھے دن حالت بگڑ گئی۔
 ہو تھی تو پرانی جانی۔ مگر ساس کی پٹی لمحہ بھر نہ چھوڑی۔ نچاست۔ صندل اور
 تھوک امرت کر دیا۔ بھر بھر روال بلغم کے اسپینے ہاتھ سے پھینکتی اور تیروری پر بل
 نہ آتا وہ جس کا کام تھا۔ اُس اللہ کے بندے یعنی صہیبت نے ذرا پروانہ کی بغیر
 کی طرح دونوں وقت آیا۔ کھڑے کھڑے خیر صلاح پوچھی اور چلتا ہوا۔ ماترپ
 رہی ہے اور پلک رہی ہے۔ مگر اس کے کان پر جوں نہیں ہلتی۔ حد یہ ہے کہ ماکا
 جنازہ احاطہ میں پڑا رہا۔ مگر وہ جب تک کنگھی۔ برش۔ کوٹ پتلون سے فارغ نہ
 ہو گیا۔ باہر نہ نکلا۔ بی مخلصی کو آخری وقت معلوم ہوا کہ جس صورت کی دیوانی اور
 جس لال کی پروانہ تھی وہ بھی اپنا نہ تھا۔ چوتھے روز جب حالت زیادہ خراب
 ہوئی تو اُس نے بیٹے اور بہو دونوں کو بٹھا کر کہا:۔

”اب میں دنیا سے رخصت ہوتی ہوں۔ لیکن اس خیال سے
 خوش ہوں کہ گھر اس عورت کے سپرد ہوتا ہے جو اس وقت
 کنبہ بھر کا مول ہے۔ میں خوش نصیب تھی کہ خدا نے مجھ کو ایسی
 بہو دی اچھا بیوی میرے پاس اور میرے گلے لگے کہ میں تنکو خدا کے
 سپرد کر دوں۔“

ضمیمہ ماکا یہ گفتگو سن کر مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔ مگر ساجدہ کی آنکھ سے
 آنسو گرنے لگے۔ وہ روتی ہوئی بڑھی۔ ساس کے ہاتھ کو ہوسہ دیا۔ تسکین دی۔
 ضمیمہ کو گئے مشکل سے آدھا گھنٹہ ہوا ہو گا کہ ماؤنیا سے رخصت ہوئی

چوتھا باب

جیسا دیس دیسا بھیس دی ہی گھر تھا اور وہی گھر کے لوگ۔ مگر ایک ساجدہ نے حالات میں آسمان وزمین کا فرق کر دیا اور سوا ضمیر کے کوئی متنفذ ایسا نہ رہا جو صبح اٹھتے ہی سب پہلے نماز اور تلاوت کلام اللہ نہ کرتا ہو۔ مغلانی خدا اس کی روح کو نہ شرعاً نہ خسیس نہ تھی خیرات بھی کرتی تھی اور زکوٰۃ بھی دیتی تھی۔ مگر اس کی ذات سے صرف خوشامدیوں کو فائدہ تھا جس نے اگر دو باتیں ملائیں اور جھوٹی سچی خوشامدی اسی کا کام بن گیا۔ ساجدہ دینے میں ساس سے بڑھی ہوئی تھی مگر موقعہ دیکھ کر اور حالت پہچان کر۔ بے نمازن عورت سے تو وہ بات تک نہ کرتی اور تو اور حد یہ ہے کہ اگر دو چار دفعہ میاں کی انٹی سپر بھی سن لیتی تو ایک آدھ دفعہ اپنا چھوٹا سا وعظ اس کو بھی سنا ڈالتی۔ مختصر چند ہی مہینہ میں ضمیر کا گھر ساجدہ کی بدولت خاصی چھوٹی سی مسجد بن گیا۔ ہر طرف سے اللہ رسولؐ ہی کی آوازیں آتی تھیں۔ میاں بیوی میں سلوک اور محبت اختلاف جو جو کچھ ہونا چاہیے۔ سب ہی کچھ تھا۔ مگر خیال کی مخالفت کسی طرح کم نہ ہوتی تھی اور گو اس اختلاف نے کبھی لڑائی کی صورت اختیار نہ کی۔ مگر خفیہ سی بدیزگی اکثر ہو جاتی اور وہ اس طرح کہ ضمیر ہوا خوری کو تیار کھڑا ہے۔ بیوی سے رومال مانگا۔ وہ اللہ کی بندی سجدہ میں پڑی ہے۔ مجبور خود ڈھونڈ کر نکالا یا بیلا ہی لے کر جانا پڑا۔ ساجدہ کو شرعاً ایسا کرنے کی مجاز تھی۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس نے ہمیشہ اس کو محسوس کیا۔ اور یہ کوشش کی کہ خدا کے فرض کی ادائیگی شوہر کی خدمت میں رخصت نہ ڈالے ضمیر کو بھی اس کا پتہ تھا

اور اسی وجہ سے وہ بعض دفعہ ہر قسم کی تکلیف برداشت کر لیتا تھا۔
 دنیا میں کچھ بھی ہوا کرے۔ مگر قدرت کا قانون خاموشی کے ساتھ
 اپنا کام کرتا ہے۔ مخلدنی کو مرے شاید ڈیڑھ یا پونے دو سال ہوئے ہونگے
 کہ ساجدہ ایک بچی کی ماں بن گئی اور دوسرے ہی سال دوسری بچی کی۔ یہ
 دونوں بچیاں زاہدہ اور شاہدہ اگر دادی کی زندگی میں پیدا ہوتیں تو شاید ساجدہ
 ایک خاص حد تک ان کی پرورش سے سبکدوش ہو جاتی۔ لیکن اب ماتھی تو وہ اور
 دادی تھی تو وہ۔ ضمیر اپنے خیالات میں ہمیشہ مست رہنے والا شخص تھا اتفاق کی
 بات ہے ایک روز وہ مغرب کے وقت ٹینس کھیل کر آیا تو بیوی بڑی بچی کو گود میں
 لئے باہر کھڑی تھی زاہدہ اس وقت خاصی ڈیڑھ برس کی تھی باپ کو اچھی طرح
 پہچانتی تھی۔ ہلک کر ماتھ پھیلے۔ باپ کا خون بھی جوش میں آیا اور گود میں لے
 اور ہلنے لگا۔ ڈیڑھ برس کی بچی کی بساط کیا تھی۔ ٹوپی کا پھندا دیکھ کر باغ
 باغ ہو گئی اور پکڑنے لگی۔ ٹوپی باپ کے سر سے اتر کر بچی کے ماتھ میں آئی اور
 زمین پر گر کر مٹی میں بھر گئی۔ غلطی خود ضمیر کی تھی جیسے بچی نے ٹوپی لی تھی نہ لینے
 دیتا یا لے کر پھر اڑھ لیتا اس وقت تو خاموش ہو گیا۔ مگر جب نیچے گری اور مٹی میں
 بھری تو البتہ تیوری پر بل آگیا اور یوں کی یوں ہی مٹی میں سخی کچھ میں بھری ٹوپی
 لے بچی کو اور ٹوپی کو بیوی کے سامنے لا کر پھنک دیا اور کہا ڈیڑھ برس کی بچی اپنے مطلب
 کے لئے دنیا بھر کی باتیں بگھارنے کو موجود۔ کھانا نہ مانگے۔ پانی یہ طلب کرے۔ کیا
 اسے مانگنی آئے مگر ٹوپی کو ٹوپی نہ سمجھے۔ لیکن اس میں محصوم کا کیا قصور جیسا
 اٹھایا دیسی اٹھی۔ جیسا سدھایا دیسی سدھی۔ پتہ ماں کے پیٹ سے کچھ سیکھ
 نہیں آتا۔ جس رستہ پر ڈال دیا پڑ گیا۔ تم جیسی قابل ماں کی گود سے جو زمانہ
 کو بچا نے نہ وقت کو دیکھے جتنے بدتمیز اور پھوٹے پیدا ہوں۔ درست اور

ٹھیک۔ خیر ایک کاستیاناں تو ہوا تم جانو اور یہ بد نصیب جانے۔ اس کی تھکر پر پھونسی تھی پھوٹی۔ مگر مہربانی فرما کر چھوٹی کی پرورش میں دخل نہ دینا۔ جس طرح میں چاہوں گا پال لوں گا اور پلوں گا۔

ضمیر کا اتنا اشارہ ساجدہ جیسی عورت کے لئے کافی بلکہ کافی سے بھی زیادہ تھا۔ اس نے میاں کی بات گرہ میں باندھ لی اور شاہدہ سے دودھ کے سوا کوئی واسطہ نہ رکھا۔ باپ نے ایک نرس اور ایک کھلائی مقرر کر دی تھی۔ دن رات ان کے ہی پاس رہتی۔ صبح اپنے سامنے اس کو غسل کرانا۔ کپڑے بدلوانا۔ ناشتہ کروانا۔ دوپہر کو اپنے روبرو اس کو سبق دلوانا۔ پچھلا سنا آگے پڑھوانا۔ شام کو اپنے ساتھ ہوا خوری کو لے جانا۔ سیر دکھانا۔ لکیر سنانا۔ باتیں بتانا۔ آنکھ بند کر کے دن نکل گئے زاہدہ دسویں اور شاہدہ نویں سال میں تھی۔ کہ ایک روز شام کے وقت ضمیر شاہدہ کو لئے سیر سے واپس آ رہا تھا۔ نرس بھی ساتھ تھی۔ برج کے پاس آ کر گھوڑا بھڑکا اور اس بُری طرح کہ نہ اپنے سے رُکا نہ سائیس سے کھما۔ خدا کو کچھ بہتری کرنی منظور تھی۔ کہ جلدی سے ضمیر نے چچی کو نرس کی گود میں پڑا۔ وہ پیچھے بیٹھی تھی جھٹ سے بچی کو لے کر دپڑی۔ گھوڑا اسی طرح چمک رہا تھا۔ مارا چمکا راڈا نٹا ڈپٹا۔ مگر قابو میں نہ آیا۔ مجبور خود ضمیر بھی باگ چھوڑ کر دوڑا لگ جا کھڑا ہوا۔ ضمیر کے کودتے ہی گھوڑا گاڑی سمیت نالی میں گھوڑے کے بھی چوٹ آئی۔ گاڑی بھی چوڑا ہو گئی۔ مگر جان بچی لاکھوں پائے۔ ضمیر کی نگاہ میں اس واقعہ کو خدا سے مطلق واسطہ نہ تھا۔ اس نے نرس کو جو عیبائی تھی۔ سلاستی پر بہت بہت مبارکباد دی۔ چچی کو اٹھا کر پیار کیا۔ مڑا کر دیکھتا ہے لڑکے کے درخت کی جڑ میں ایک اپانچ اپنے زخم کبیل سے چھپائے پڑا ہوا ہائے ہائے کر رہا ہے۔ تیور سی پر بل ڈال کر آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ اپانچ نے کہا:-

”کچھ دے“

ضمیمہ کو سخت اور شاہدہ کو بہت ہی سخت ناگوار ہوا۔ ابھی باپ کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ شاہدہ بولی ”کس قدر بد تہذیب آدمی ہے۔ ہم سے مانگنے کا اسے کیا حق حاصل ہے۔“

ضمیمہ پیر۔ ”ان لوگوں میں بیکار رہتے رہتے یہ عادت پیدا ہو جاتی ہے کہ اپنے کام بھی دوسروں پر ڈال دیں۔ کم بخت اپنا حق سمجھتے ہیں اسی واسطے لندن میں بھیک مانگنے کا حکم نہیں ہے۔ ہر شخص خواہ کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو محنت کرے اور پیٹ پالے۔“

شاہدہ۔ ”ان کی اس بے حیائی کے ذمہ دار ہم ہی ہیں اگر ان کو بھڑک دیں اور ان کو خود مصیبت اٹھانی پڑے تو یقیناً انکی عادتیں چھوٹ جائیں لیکن اسکی کیا علاج کہ ابھی کوئی بیوقوف مسلمان ادھر سے نیکلے گا تو پیسہ کیا کھانا تک ان کو کھلا دیکھا۔“

ابا بیج۔ ”آپ میرے قریب آئیے میرے زخموں کو ذرا دیکھئے۔ مجھے سخت تکلیف ہے۔ بھوک کے مارے مر رہا ہوں۔ ہونٹوں پر سپرٹریاں بندھی ہوئی ہیں اور کل شام سے پانی اور کھانے کو ترس رہا ہوں اب میری حالت رحم کے قابل ہے۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ ہل سکوں بخار چڑھا ہوا ہے۔ کروٹ لے نہیں سکتا۔ میں نے آپ کو مسلمان سمجھ کر پیسہ مانگا تھا۔“

ضمیمہ پیر۔ ”تیرے زخم دیکھ کر اپنی طبیعت بگاڑوں حالانکہ اس کے خیال سے میرا جی متلائے لگا۔ تیری نبض دیکھوں۔ بخار کا پتہ لگاؤں۔ چاہے وہ مرض متعذر ہی کیوں نہ ہو۔ تیرے جسم کو ہاتھ لگاؤں خواہ خود ہی میرا ہمار پڑ جائوں۔“

شاہدہ پیر۔ ”چلیے بابا چلیے اس سے بات مرنے کی ہے۔“

نکار ڈی ٹوٹ چکی تھی اور سانس بھی رخصی ہوا تھا۔ دونوں باپ بیٹیاں اور بیٹیاں

پیدل گھڑے۔ ساجدہ نے جب یہ واقعہ سنا تو میاں سے یا بیٹی سے تو کچھ نہ کہا۔ وضو کر دو نفل شکرانہ کے پڑھے اور اسی وقت دس بچوں کا کھانا یتیم خانہ میں بھیجا آدمی کھانا لے جا رہا تھا کہ خمیر نے بھی دیکھا۔ ہنسا اور بیٹی سے کہا تم دیکھ رہی ہو تمہاری جاہل مایکیتا شے دکھا رہی ہیں۔

نشا ہر ۵۔ ”جی ہاں وہ ان تمام باتوں کو خدا کی طرف سے سمجھتی ہیں۔“
 ”مگر کوئی اس نیک بخت سے بوجھنے کہ بیوقوف ان باتوں کا خدا سے واسطہ کیا۔ اگر جان خدا نے بچائی تو گھوڑے کو بھی اسی لئے بھر دیا۔ فرض کرو یہ سنا نہ کہ تم کو نرم کورس لیکر نہ اتر جاتی تو کیا تمہاری ماں کا خدا اس وقت بھی بچا لیتا۔“ افسوس یہ ہے کہ جاہل مائیت نے بڑی بچی کا بھی اپنے ساتھ ماس کیا ہیں نہ دیکھتا ہوں کہ وہ خیالات کے اعتبار سے دوسری مائیت وہی جاہل مائیت وہی تصویر اور وہی حاکمیت۔
 اس واقعہ کو تیسرا پہلو ہوا ہو گا کہ جاڑوں کے موسم میں ایک روز دوپہر کے وقت ساجدہ کا کوٹھے پر نماز ظہر دیکھو پیسا میں پڑھ رہی تھی۔ اور ڈاھڈا ساتھ تھی۔ دونوں ماہیلیاں نماز پڑھ چکیں تو ساجدہ نے نیچے کے گھروں میں ایک نظر ڈالی خمیر کی کوٹھی کے پاس ایک چھوٹا سا حملہ آگہ گھرے کے نام سے مشہور تھا جس میں کچھ غریب اور یہ نصیب لوگ اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔ ساجدہ کی نظر ایک بیمار پر پڑی جس کے سر پرانے ایک عورت بھی آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھی۔ مریض کا مکان دیوار سے ملا ہوا تھا۔ اور دالان جہاں مریض کا بستر تھا بالکل آنکھ کے سامنے اُس میں صرف نین عمیق تھیں انھیں ایک بڑھیا ایک رانڈ دوسری کواری بیٹی۔ ان کے سر پر کوئی مرو نہ تھا اور پسر اوقات کا سلسلہ درزی کی سلفائی اور گوسٹے کی مزدوری تھی۔ شریف لوگ زمانہ کو جاننے اور وقت کو پہچانتے تھے۔ جو پڑسی وہ چھلی جو آئی وہ اٹھائی جو بیسٹہ آیا وہ کھا لیا جو لگیا وہ بھر لیا۔ بڑھیا تھی تو غریب بلکہ فقیر مگر اس آن کی عورت اور شان کی آدمی کو سوال

یا طبعی تو درکنار یہ سن کر اور سمجھ کر کہ ساجدہ کے ہاں خیرات ہو رہی ہو کبھی گھر کی ہوا تک نہ مچکنے دی۔ ساجدہ ٹھنکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ بڑھیا جانا زبردستی اور بیڑہ بہن کو اسی بہن کے پاس خون کے آنسو گر رہی تھی۔ اس کی مفارقت کا خیال اسکی موت کا یقین اس کی وداع کا احتمال کیلئے پر برے لگا رہا تھا۔ سردی سنت تھی اور ہوا تیز۔ شام قریب تھی، اور رات سر پر بیمار بچی جس کے بدن پر اب بھی ایک بھٹی سی دلائی کے سوار وئی کا کپڑا نام کو نہ تھا نمونیا میں سہوش پڑی تھی۔ ماٹھی اور دوا کے برے اس کا منہ کھول کر دعام کی۔ آنکھ سے آنسو کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ دوا کیو اسطے پیسہ پاس نہ تھا۔ رات تینوں دھول پر صبا نکل چکی تھی۔ اور دن بھی اس فاقہ میں ختم کے قریب تھا کہ بیمار نے آنکھ کھولی اور کہا بھوک لگ رہی ہے۔ کیلچہ بچ رہا ہے۔ دوپچھے دودھ کے دید و مانے بٹی کی آواز سُنی اور قریب پہنچا کہ منہ پر ہاتھ پھیرا اور رو کر کہا بیٹی پیسہ نہیں ہے رات سے اللہ ہی اللہ ہے بیمار نے کچھ جواب نہ دیا کہ درزی نے اگر کہا "لاؤ گرنہ دے دو"۔

پرٹھویا۔ "بھائی ابھی نہیں ہوا۔ بچی بیمار ہے۔ اس کی بیماری میں دونوں لگے ہوئے ہیں اللہ جیسے کل ضرور لے جانا۔"

درزی۔ "کل بکرتے والا میلہ میں کیا پہن کر جائے بچی بیمار ہے تو جوئی کے صدقہ سے یہ پیسہ جو پہلے دیدے وہ مفت کے تھے۔ تم ہسٹری بے غیرت کہ زبانی باتوں کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ لاؤ میں میرا گرنہ یوں کا یوں ہی دے دو اور اب شریف ہو تو مجھ سے کپڑا نہ لینا۔"

پرٹھویا۔ "بیٹا تصور تو ضرور ہو گیا مگر معاملہ ایسا ہی تھا۔ بچی کے بچنے کی امید نہیں ایک پیسہ دوائی ٹھنڈائی کو نہیں۔ کچ رات کو جس طرح ہو گا بڑی سے تیار کر داونگی۔"

درزی۔ "بس زیادہ باتیں نہ بناؤ انہیں بڑی نمازی پر سہیزگار دنیا بھر کی بھونٹی

مگر سید سے ہاتھ سے کرتے اور دو آنے کے پیسے ادھر رکھ۔“

بڑھیا: بیٹا پیسہ تو ہے نہیں، گرتے حاضر ہے، چاہے چھوڑ دیا ہے لے جاؤ۔“

درزی: ”میں نے تجھ جیسی سینکڑوں دیکھ لی ہیں۔ پیسے ادھر رکھ دے۔“

بڑھیا باتیں کر رہی تھی کہ بڑی بچی نے گھبرا کر آواز دی ”اے بی ماں۔ ادھر تو

آؤ دیکھو تو سہی اسے کیا ہو رہا ہے اس کے تو ہاتھ پاؤں مڑ رہے ہیں۔“

بڑھیا: ”ہائے کیا کروں۔ اے بچی خدا کے لئے کچھ تو کھول نہتی لے

پانی تری۔ اس کے دانت بند ہو گئے۔ پانی کیوں کر ڈالوں؟ چچے بھی تو نہیں ہے۔“

درزی: ”چچے کی بچی میں تیرے دادا کا نوکر ہوں کہ دکان چھوڑے تیرے

گھر پر کھڑا ہوں ماحلدی سے کرتے اور پیسے۔“

بڑھیا: ”بیٹا اللہ کی قسم پیسے تو نہیں ہیں۔ گرتے لے لو۔ یہ طشتری لے لو

دو آنے کے بدلے۔“

درزی: ”دیکھوں! یہ طشتری تو چار پیسے کی بھی نہیں ہے۔ رنگ میں

ڈوبی رنگ میں لتھڑی ہے کس کام کی۔“

بڑی لڑکی: ”اچھی ماں خدا کے واسطے آؤ یہ تو منہ کھول رہی ہے۔

پانی تو ٹپکا دو۔“

بڑھیا: ”بیٹا میں اور پیسے تم کو دیدوں گی۔ تم اب جاؤ۔“

درزی گرتے اور طشتری لے کر اُدھر گیا۔ بڑھیا ادھر آئی تو مٹی کے آنچورے سے پانی

بچی کے حلق میں ڈالا۔ ساجدہ اوپر کھڑی یہ تمام واقعہ دیکھ رہی تھی۔ اور زلہ کا کود

بھی رہی تھی۔ جب پانی پیار کے حلق سے زیادہ اُس کے اوپر گرے لگا اور اُس نے کراہنا

شروع کیا۔ تو وہ بچی کو لئے نیچے اُترتی تو ضعیف بیٹھا ہوا شاہد سے کھیل رہا تھا۔

بیوی: ”میں ذرا اٹھ گھر سے تک جانا چاہتی ہوں، ہو آؤں؟“

ضمیمہ۔ کیوں خیریت۔ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہوئی؟

بیوی۔ نیم والی بڑی بی کے ہاں جاؤں گی۔

ضمیمہ۔ وہ فقیرنی ٹکر گدھی سرخوڑا تھی کہ بھوکی رہے اور یہاں آکر جھانکے
تک نہیں وہاں تمہارا جانا ہرگز تمہاری شان کے لائق نہیں۔

بیوی۔ یہ ٹھیک ہے مگر اس وقت تو تم مجھ کو اجازت دے دو۔

ضمیمہ۔ ایسی ہی ضرورت ہے تو چلی جاؤ۔ مگر اپنی عزت کو خود نہ سنبھالو گی
تو یاد رکھو کہ وہاں تک کی نگاہ میں ذلیل ہو جاؤ گی۔ اس کا تو نصیب کھل جائے گا۔
کہ تم وہاں گئیں مگر تمہاری عزت میں فرق آئے گا۔

بیوی۔ تم اجازت دے رہے ہو تو اس بحث کو جانے دو۔

ضمیمہ۔ اچھا جاؤ چلی جاؤ۔

بیوی۔ تم ذرا ڈاکٹر کو بلا دو اور وہیں بھیج دینا۔ ڈولی منگوا چکی ہو سکتی
بٹھا بڑھیا کے پاس آئی۔ دروازہ میں کھڑے ہو کر پوچھا "میں آ جاؤں؟"
دونوں مابینیاں سکتے میں رہ گئیں۔ آخر بڑھیا نے کہا "ہاں بیگم آ جاؤ۔"
ساجدہ اندر پہنچی تو بیٹھنے کو کوئی جگہ نہ تھی۔ بڑھیا نے لپک کر اپنا برقع بچھا دیا۔
اور کہا بیگم اس پر بیٹھ جاؤ۔ ہمارے ہاں کوئی چیز آپ کے لائق تو ہے نہیں آپ نے
مجھے وہیں بلوایا ہوتا۔ میں آجاتی آپ نے کیوں تکلیف کی۔

ساجدہ۔ "تکلیف کی کیا بات ہے یہ چھوٹی بچی کیا بیمار ہے؟"

بڑھیا۔ بیوی کیا بتاؤں اگلے جمعہ کو صبح کی نماز خاصہ اچھی طرح پڑھی۔
سر جھٹ رہا تھا۔ کہنے لگی "تہا لوں" میں نے کہا "اچھا" ٹھنڈے پانی سے نہانی نہ کر
اٹھی تو پسلی میں درد تھا۔ پھر بخار چڑھا۔ جب سے ابھی ہی بے سرت پڑی ہے۔

ساجدہ۔ "آپ نے کچھ دوا وغیرہ پلائی؟"

بڑھیا

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ڈاکٹر آگیا۔ پردہ ہوا۔ دیکھا۔ نسخہ لکھا۔ دوا آئی اور اپنے سامنے دو دو گھنٹے بعد ساجد نے دو خوراکیں پلائیں۔ چلتے وقت دیکھتے ہوئے نقد دینے اور کہا "میں صبح ہی پھر آؤں گی۔"

جس وقت ساجد اور زاہد ڈولی میں بیٹھے لگیں تو بڑھیا پاس کھڑی تھی۔ شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ مگر زبان نہ اُٹھتی تھی۔ آنسوؤں کا ایک تار بھا جو ساجد کی عنایت کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ شام کو سب سے پہلے چار آدمیوں کا کھانا سیر پھر دودھ اور تین لٹات بڑھیا کو بھیجے۔ دوسرے روز جب ساجد گئی ہے تو بیمار کی حالت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ہفتہ پھر تک برابر دوا جاری رہی اور لڑکی تندرست ہو گئی۔ بڑھیا نے ساجد سے تو کچھ نہ کہا۔ مگر اس کی داسے جا کر جو کچھ کہا اس کا اثر اتنا ہوا کہ اُس نے فوراً بیٹی کو یہ خط لکھا :-

"ساجد بیٹی کو ماں کی طرف سے بہت بہت دعا۔ آج نیم والی بڑی پی آئی تھیں جس طرح انہوں نے تمہاری تحریکیں میرے سامنے کہیں اور جس دل سے دعائیں دی تھیں۔ میں تمہارے سامنے بیان نہیں کر سکتی۔ کیا بتاؤں کس قدر خوشی ہوئی ہے۔ انسانیت کے یہ ہی سخی ہیں اور دولت کی یہ ہی تعریف ہے کہ حاجتمندوں کے کام آئے اور مفلسوں کو مدد دے۔ زندگی اسی کا نام ہے اور اسلام اسی کو کہتے ہیں۔ کہ انسان ہر رنگ میں اور ہر حال میں موت سے غافل اور انقلاب سے بے خبر نہ ہو۔ تم کہیں تمہارا جانا معمولی بات تھی۔ مگر نہیں تم نے ایک دل فتح کیا۔ ایک مسلمان کے کام آئیں۔ تم نے ایک جج کیا۔ ایک گتے ہوئے مکان اور ایک اُبڑے ہوئے دل کو تعمیر کیا۔ آباد کیا۔ تم نے دنیا کو

نہ دیکھا ہو لیکن تمہارے ہر قدم پر تمہارے ہر سانس پر ایمان کے فرشتے مرجھا کے نعرے لگاتے تھے۔ تم نے ایک قرض تم نے ایک امانت اس کو دی اس کے پاس رکھوادی جو سچا مہاجن اور پورا امین ہے اور جس وقت ہر تنفس نفسی نفسی پکار رہا ہو گا تمہاری یہ خدمت تمہاری یہ امانت تم کو واپس ملے گی۔ تم بڑھیا سے بہت زیادہ عاجز مند ہوگی۔ پیار سے بہت بڑھ کر مضطرب ہوگی۔ پہاں تین عورتیں ایک گھر میں تھیں۔ وہاں سب ہوں گے اور کوئی نہ ہوگا۔ مجھ جیسی ماں جو صورت کی عاشق زار ہے منہ پھیر لے گی اور مساجد جیسا باپ جو مرتے مرتے گلے لگاتا رہا اٹھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔

پیارے بیٹی تمہاری ہستی کیا تھی۔ اس حکم الحاکمین نے اپنی قارت سے اپنی عنایت سے تم کو دولت دی۔ بیگم بنایا۔ کیوں اس لئے کہ دولت دے کر دیکھے۔ اور حکومت دے کر آرائے۔ جو کر ہی ہو اس میں فرق نہ آئے اور جو سمجھ رہی ہو اس میں کمی نہ ہو۔ زندگی کے ساتھ موت۔ صحت کے ساتھ علالت، تمول کے ساتھ عشرت لازمی اور یقینی ہے کوئی فعل ایسا نہ ہو جائے کہ بعد میں بچتا ہو۔ سُنّتی ہوں کہ نماز گنڈے دار ہو گئی۔ خدا کی قسم مساجد بہت رنج ہوا۔ میرے دودھ کو یہ آگ لگی کہ مسلمان کی بچی۔ ہٹی کٹی موٹی تازی افان سنے اور پاں کھائے۔ یہ عزت ہمیشہ یہ دولت سدا اور یہ زندگی زیادہ دیر رہنے والی نہیں۔ موت سر پر موجود ہے اور پہنچا ہے اس گھر میں جہاں عزیز اور غیر کوئی بھی کام نہ آئے گا۔ اندھیرا

گھسپ ہوگا۔ سانپ بچھو۔ کیرے۔ کھنکھورے اس جسم کو جو آج
 خدا کے سامنے بھگتے ہوئے اچکیا تا ہے جھلنی کر دیں گے۔ وہاں یہ
 نماز ہی ایسی چیز ہوگی جو اندھیرے کو اجالا اور قبر کو روشن کر دیگی۔
 دنیا کے بہت سے مرحلے دیکھ لئے کو اپنے سے دہن بنیں۔ پیوستی
 مانیں۔ لڑکی سے گھر والی بنیں۔ لیکن ابھی کچھ اور بننا ہے اور
 وہ سب سے پیچیدہ اور سب سے نازک مسئلہ ہے۔ ساجد
 اس وقت کو نہ بھول اور تیار رہ ہر وقت اس امتحان کے۔ اس
 جواب کے۔ اس عذاب کے واسطے جو موت کے ساتھ ہی شروع
 ہو جائے گا۔

پانچواں باب

ضمیر ستا ہدہ کی پرورش میں دن رات مہمک تھا اس نے اپنی دانستہ میں
 اپنی بساط کے لائق اور اپنی حیثیت کے موافق کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کھلانے
 کے واسطے نرس۔ پڑھانے کے واسطے مس۔ مشن میں تعلیم اس نے دلائی میمنوں
 کی صحبت میں اس نے رکھا۔ مختصر یہ کہ صبح سے شام تک صرف تعلیم کی کوشش اور
 اصلاح کا ضبط تھا۔ ماسے اس کا واسطہ ہمیشہ ہی برائے نام رہا۔ ہشیار ہوئی
 تو بس اتنا تعلق ضرور تھا کہ مدرسہ جاتی دفعہ اور آتی دفعہ کھڑے کھڑے دوچار
 باتیں۔ ورنہ ایک علیحدہ کمرہ جوابا پنے اس کو دیا تھا اور تاکیک کر دی تھی کہ
 بلا اجازت کوئی نہ جانے پائے۔ رات بھر اس میں رہنا اور جو جی میں آئے وہ پڑھنا
 پرفلاں اس کے زاہد مائی دوسری تصویر تھی۔ غرض ایک بیٹی باپ کی اور ایک مائی۔

یہ ضمیر کی کھلی ہوئی زیادتی اور علانیہ حق تلفی تھی کہ چھوٹی پرانٹھریاں اٹھاتا اور اُن نہ کرتا۔ اور بڑی کو چھوٹی کو دینا اور ہر وقت جلتا۔ اس کی عادت اس کی خصلت اس کی باتیں اس کی صورت ہر چیزِ ظالم کو زہرِ معلوم ہوتی تھی۔ شاہد کے ساتھ ساجد کا یہ سلوک نہ تھا اس کو دونوں آنکھیں ایک تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ جو چاہے کھا سکتی اور منگو سکتی ہے۔ لیکن جب اس نے کسی چیز کا حصہ کیا تو وہی شرعی آدھا اس کو آدھا اس کو۔

زاہدہ چودھویں اور شاہد تیرہویں برس میں تھی کہ ایک روز شاہد کو اپنے کمرہ میں ڈر لگا۔ سوتے سوتے کچھ ایسی ہیبت بٹھی کہ گھگھی بندھ گئی۔ کمرہ اکبلا تھا ما اتفاق سے جاگ رہی تھی۔ اُٹھی گئی دیکھا تو واقعی بچی تھر تھر کانپ رہی ہے ہیشہ کیا توجاگی۔ مگر در کچھ ایسا بیٹھا تھا کہ بات نہ کر سکتی تھی۔ میاں کو بلایا تو اس نے کہا سینہ پر ہاتھ پڑ گیا ہوگا۔ دوسری کر دے سے سُلا دو۔

بیوی۔ میں تو اب اس اکیلے کمرے میں نہ سوتے دوں گی۔ اگر میری آجی نہ نکلتی تو کیا ہوتا وہاں لے جا کر سُلاؤں گی یا آپ یہاں سوؤں گی۔
میاں۔ نہ تمہارے یہاں سوتے کی ضرورت نہ اس کے وہاں جانے کی۔ بس تم جاؤ سوؤ۔

بیوی۔ اچھا بیٹی تو آیت الکرسی پڑھ لے۔ مگر ہاں تجھے آتی ہی کہاں ہے؟
میاں۔ ایسی ہی کرسی کی ضرورت ہے تو میں کرسی لا دوں۔ وہ رکھ دو۔
بیوی۔ تو بہ تو بہ تمہارے ایمان کو کیا ہو گیا۔

ضمیر باہر جہاں گیا شاہدہ سو گئی۔ ساجد آکر بیٹی تو سب سے پہلے اس کو میاں کی اس کرسی کا خیال آیا کہ ان کے ایمان کو کیا ہو گیا۔ آیت الکرسی کا ایسا مضحکہ تو کیا کروں کس طرح اصلاح کروں کسی طرح خدا یاد نہیں آتا۔ اس کے بعد بیٹی کی گمراہی

کا جھکڑ بندھا کہ مسلمان کی بچی درود شریف اور کلمے سے واقف نہ ہو۔ اس کا عذاب تو مجھ پر پڑے گا۔ اور سب باتوں کو جانے دو نماز بھی تو نہیں آتی۔ ہائے کیا ہو گیا اور کیا کروں گی۔ ان خیالات میں اس قدر محو ہوئی کہ نیند صاف اڑ گئی ہر چند چاہا کہ کسی طرح سوؤں۔ مگر کسی کر دھچکین نہ پڑتا تھا۔ اٹھی چپکے سے کمرے میں گئی۔ اس کے سر ہانے کھڑی ہوئی آہستہ آہستہ آیت الکرسی پڑھی اور حصار باندھ کر چلی آئی۔

دونوں بہنوں کی جس طرح تربیت میں بعد المشرقین تھا اسی طرح خیالات میں بھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ چھوٹی نہ صرف بڑی کو جاہل۔ بچو ہر بے وقوف اور نا کارہ سمجھتی تھی۔ بلکہ اس سے بات کرنی بھی کچھ کسر نشان سی سمجھتی تھی۔ یہ تو کبھی ہوا ہی نہیں کہ زہدہ شاہدہ کے کمرے میں گئی ہو۔ یہ کسی دفعہ ہوا کہ کسی ضرورت سے یا محبت سے کوئی بات اس نے بہن سے کی اور وہ جھٹ سے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ زہدہ کو ناگوار تو ہوتا۔ مگر اتنا کہ دل میں بل بھر کر بیٹھ جائے لیکن اس میں کام نہیں کہ اگر زاہدہ ایک دفعہ بھی ایسا کرتی اور بہن کی بات کا جواب نہ دیتی تو نشانہ وہ کٹر لڑکی اور کینہ ور بچی تھی کہ شاید عمر بھر بہن کی صورت نہ دیکھتی۔

ایک پیٹ کی دو بچیاں اور ایک باپ کی دو لڑکیاں۔ ایک گوشت ایک پوست مگر تربیت کے منفرد اثرات نے دونوں کے خیالات میں اتنا کچھ فرق کر دیا کہ ایک مشرق میں تھی تو ایک مغرب میں۔ زہدہ مؤذن کی اذان کے ساتھ اٹھتی۔ باوجود ایک چھوٹے دروازوں کے اگر کسی کی آنکھ نہ کھلتی تو اپنے ہاتھ سے پانی گرم کر لیتی گرمی ہوتی تو خود ہی ٹھلیا بھر سب سے پہلے نہاتی۔ اس کے بعد نماز پڑھتی اور کلام اللہ میں مصروف ہو جاتی۔ اس سے فارغ ہو کر خود کمرے میں جھاڑو پتی یا اپنے سامنے دلاتی اور پھر باورچی خانہ میں جا پہنچتی اور ماں کا ہاتھ بٹاتی۔ نسا صبح اٹھ بچے سو کر اٹھتی اور بچھوٹوں میں لیٹے لیٹے چائے بسکٹ کھاتی۔ جب ناشتہ

ہو جاتا۔ تو اُنھ کو مُنہ ہاتھ دھوتی۔ کنگھی چوٹی کرتی اور مشن کی کتاب نئی شروع کر دیتی۔ دس بجے کے قریب مدرسہ چلی جاتی۔ بارہ بیسے کی بیماری اس کے پیچھے ایسی لگی کہ کوئی دن بغیر شکایت کے بسر نہ ہوتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ محنت کرتی نہ مشقت مگر کے کام کاج سے اسے کوئی واسطہ نہ تھا۔

شاہدہ کی بیماری سے ماں اور باپ دونوں پریشان رہتے تھے ساجدہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ جو اتنا بڑ گئی وہ اچھی نہیں۔ بھلا کو اپنے کی عمر بے فکری زمانہ آزادی کے دن۔ اس وقت بیماری کیسی۔ اگر اب بھی بڑی کی طرح چلنے پھرنے لگے تو چار دن میں گھوڑا سی دوڑے مگر میاں کی وجہ سے ہوں نہ کر سکتی تھی۔

بھٹاباب

اب تک تو ساجدہ کو شاہدہ کی تربیت کا رونا رہا۔ مگر اب خدا نے دو لڑکیوں کے ساتھ ایک بیٹے کی ماں بھی بنا دیا۔ لڑکے کی پیدائش سے ضمیر کو جس قدر خوشی ہوئی وہ بیان نہیں ہو سکتی۔ چھ دن اور رات دوستوں کے جلسے ہوئے۔ ناچ ہوا۔ گانا ہوا ڈنر ہوا۔ پارٹیاں ہوئیں جس روز ساجدہ چھٹی نہائی ہے۔ اس روز بچہ کا عقیقہ تھا اور اس نے تمام رشتہ دار عورتوں کیساتھ ضمیر کی چچا زاد بہن اپنی سندر کو بھی بلایا تھا۔ یہاں جمع ہو گئے تو عقیقہ ہوا۔ اس کے بعد ساجدہ نے سندر سے کہا کہ آؤ بواٹھ وھلاؤ۔ اور بچہ کو اپنا کرتہ ٹوپی پہنا کر منہ میں دو دھوؤ۔ شاہدہ پاس کھڑی تھی۔ ماں کا یہ فقرہ سُنکر مسکرائی اور جب پھوپھی نے اپنا کرتہ ٹوپی پہنا کر یہ رسم ادا کی تو ٹھٹھے مار کر سنسنے لگی۔ ساجدہ کو ناگوار تو بہت ہوا۔ مگر اس وقت رب کے سامنے کچھ نہ بولی۔ جب عقیقہ ختم ہوا۔ اور لوگ چلے گئے۔ ضمیر اندر آیا تو ماں کے سامنے ہی شاہدہ نے بیٹا کہا۔

”بابا آپ نے دودھ دھلائی کی رسم نہ دیکھی۔ نہایت پُر لطف تھی۔ اما جان کا دودھ دودھ سے دھویا گیا اور چھو بھی جان کو اس کے بدلے روپے دے گئے وہ بچکے سے لیکر چلتی ہوئیں۔ کرتہ ٹوپی زیادہ سے زیادہ پانچ چھ روپے کا ہوگا۔ مگر جو کچھ ان کو ملا وہ اس سے بہت زیادہ تھا۔ یہ بھی بہت اچھی تجارت ہے۔ وہ کہتی ہوں گی کہ روز بیٹے ہوا کریں۔“

ضمیمہ۔ ”بیگم تمہاری تہہ حرکت میں مصلحت ہوتی ہے۔ ہمیں بھی تہہ بتاؤ آخر اس تجارت میں کیا منفعت تھی؟“

ساجدہ میاں کے سوال کا کچھ جواب دینے نہ پائی تھی کہ شاہد نے کہا ”اُس کی منفعت میں آپ کو بتا دوں۔ دودھوں نہائے پوتوں پھلے۔“

ضمیمہ۔ (ہنس کر) ہاں بیٹی ہاں۔ دودھ سے تو اسی لئے دودھ دھویا ہوگا۔ مگر پوتوں پھلے کیوں ہوا۔“

شاہدہ۔ ”وہ اسکے آگے محذوف ہے۔ دودھ ہی سے پوت بھی ہو جاتا ہے واہ بی اما جان۔ زمانہ اتنی ترقی کر گیا مگر شہنشاہی ہے کہ آپ کے کان پر جوں نہیں چلتی۔ یہ رسوم جنہوں نے ہمارا خاتمہ کر دیا۔ افسوس اب تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ جو روپیہ آپ نے ان کو دیا اگر وہ کسی قومی کام میں صرف ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔“

ساجدہ کا چہرہ غصہ کے مارے سُرخ تھا۔ ایک رنگ آ رہا تھا۔ اور ایک جا رہا تھا۔ مگر بالکل خاموش تھی۔ ضمیر بیوی کا یہ حال دیکھ کر اور بھی چھڑنے لگا۔ اور پھر کہا ”ہاں بیگم مصلحت نہ بتائی؟“

ساجدہ۔ ”میں خاموش ہوں۔ اور اس گستاخ کے منہ لگنا نہیں چاہتی۔ تم اپنے ساتھ اس کو بھی شہ دے کر شیر کرتے ہو!“

شایدہ۔ "نہیں اما جان یہ بات نہیں ہے۔ میں آپ سے دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ اس میں کیا مصلحت ہے۔ میرے کان میں آواز پڑی رہی تو اچھی بات ہے۔"

ساجدہ۔ "تمہارا اعتراض لغو۔ تمہارا مسخکہ غلط۔ تمہاری رائے جھوٹی تمہاری عقل خبط۔ تم جس پر سنس رہی ہو یہ انسانیت کا وہ جوہر ہے جس کی تہ میں چھپتے ہوئے موتی دمک رہے ہیں۔ تم نے دو چار زبانوں سے رسوم کی قباحات سن لی اور رٹ لی لیکن اصلیت کو نہ سمجھے۔ کاش خدا تم کو عقل دینا تو اعتراض سے پیشتر اور سننے سے پہلے سوچتے اور سمجھتے کہ کیا کیا اور کیوں کیا۔ سنو اور سوچو۔ سمجھو اور غور کرو۔ آج چھ روز سے سینکڑوں روپیہ لہو بات اور خرافات میں ضل ہو رہا ہے۔ لیکن ایک پیسہ ایک کوڑی۔ ایک وقت کا کھانا کسی ایسے شخص کو نہ دیا گیا جو مستحق تھا۔ تمہارے یا تمہارے باپ کے دل میں سینکڑوں اربان ہزاروں خوشیاں لاکھوں اُمنگیں پیدا ہوئیں۔ لیکن کبھی اس زبردست ہستی کی طاقت کا اندیشہ نہ پیدا ہوا جو آٹا نانہ کھلے ہوئے پھول ٹپکتے ہوئے پودے اور چپکے ہوئے نئے اجڑ سکتی ہے۔ جو کچھ ہم کو میسر ہوا اسی خدا کے برحق کی عنایت اور رحمت سے ہمارا فرض تھا اور جب تک زندہ ہیں رہے گا۔ کہ ہر وقت ہر ساعت ہر لمحہ اپنی گردنیں اس کے حضور میں جھکائیں اور اس نعمت سے جو ہم کو دینا ہے اور دے رہا ہے اس کو بھی دیں تاکہ ہمارے کاموں میں ترقی ہماری مسرتوں میں اضافہ اور ہماری راحتوں میں برکت ہو۔ ہماری زندگیاں خالی خالی نہیں۔ ہر طرف سے فرائض اور حقوق میں لپٹی ہوئی ہیں۔ ہمارا کام کھانا۔ سیننا ہنسا اور بولنا ہی نہیں فرائض کی ادائیگی اور حقوق کی نگہداشت بھی ہے۔ ہم پر بہت سے حقوق ہیں۔ عزیزوں کے پڑوسیوں کے۔ نوکر دوں چاکروں کے۔ غریب غریبا کے۔ اور ان کے جو عزت میں شراقت میں ہم سے کم نہیں مگر دولت اور ثروت میں ہمارے محتاج اور دست نگر ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے

کہ ہمارے دسترخوان پر قورمے اور بریانی ہوں لیکن ہمارے عزیز فاقوں سے بھوکے سو رہے ہیں؟ کیا یہ درست ہے کہ ہمارے جسم پر دیبا و جربہ ہوں اور ہمارے پیارے بیوند لگائیں اور ننگے پھریں؟

تم کو رسموں پر اعتراض ہے۔ تم کس منہ سے بڑا کہتی ہو تم تو اس سے بھی بدتر کام کر رہی ہو۔ رسوم کی قباحات اس اعتبار سے درست کہ روپیہ برباد نہ ہو۔ مگر تم نے تو رات دن گلچرے اڑائے۔ کون سے طائفے تھے جو اس تقریب میں نہ آئے۔ کیا اس میں سے کچھ روپیہ خدا کی راہ پر نہ اٹھ سکتا تھا؟

رسوم بیشک قابل اصلاح ہیں۔ مگر ان کنکروں میں جو اہر بزرے ان گدڑیوں میں لال اور اس سیاہی میں سفیدی بھی ہو۔ تم کو معلوم ہے ہماری کتنا مقدس ہم کو کیا حکم دیتی ہے ذُرِ خِی الْقُرْبٰی سے پہلے ہم پر ہمارے عزیزوں کے حقوق ہیں۔ اور ہماری حالت یقیناً خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس قابل ہو کہ ہم اپنے عزیزوں کے ساتھ سلوک کریں۔ اور ان کی ضرورتوں پر کام آئیں۔ میں نے کئی دفعہ تم کو اس طرف متوجہ کیا۔ مگر تم نے پروا نہ کی۔ میرا ایمان مجھے کہ جس طرح نجاست کا ایک قطرہ پانی کے ہونے کے لئے گھر گھر سے گھر گھر سے کو تپاک کر دیتا ہے اسی طرح عطر کی ایک بوند غلیظ کمرے کو بھی مہکادیتی ہے۔ اس تمام روپیہ میں جو صرف ہوا اگر خدا قبول کر لے تو وہی ایک رقم جو میں نے تمہاری پچھو پچی کو دی، اس قابل ہے کہ تمام اس کو تپاک کر دے۔

یہ رسم جس کا تم نے مضحکہ اڑایا۔ سننے کے قابل نہیں۔ وہ کس شوق اور محبت سے کرتے تو اپنی لائیں میرے اس سے بہت زیادہ قیمتی کپڑے موجود ہیں لیکن میرا کام یہ تھا کہ ان کا دل نہ توڑتی۔ اسی لئے میں نے بچہ کو اپنے کپڑے نہ پہنائے اور ان کا دل بڑھادیا۔

کیا تم کو اس سے انکار ہے کہ دودھ کی ماش سے زچہ کا دودھ بڑھتا ہے۔ طب
کی کتابیں دیکھو۔ اپنی لیڈی ڈاکٹر سے پوچھو۔ میں پڑھ بھی چکی ہوں اور پوچھ بھی اس
فعل کو جو طب کے اعتبار سے نہایت مفید ہے۔ اگر اس صورت میں ڈھال دیا تو
کیا خرابی کی۔ تم کو معلوم ہو یا نہ ہو۔ مگر مجھے خبر ہے کہ سلیمہ جس کے نیک پر تم کو
اعتراض ہے نہایت بد نصیب عورت ہے۔ بیوہ ہے دو بچے ہیں اور ایک بڑھیا
ماں اس کا حق یقیناً تمہاری کمائی میں ہے اور میں نے جو کچھ اس کو دیا ہرگز ہرگز
اس پر احسان نہیں بلکہ تم پر ہے کہ میں نے مواخذہ عاقبت سے بچوایا۔“

ساتواں باب

کہنے کو اور کہنے کو کیا حقیقتاً دونوں بچوں کے نکاح کا مختار باپ تھا اور گو
وہ ایک کا عاشق زار اور ایک سے قطعاً بیزار مشرّع ہی سے تھا پھر بھی اُمید یہ تھی او
ایک دو کو نہیں سب کو کہ شادی کے معاملہ میں وہ جو کچھ کریگا دیکھ بھال کر اور سمجھ بوجھ کر۔
لاکھ ناخوش اور علیحدہ رہی۔ مگر اپنی اولاد تھی۔ اور بد نصیب باپ کے گھر میں چند روز کی جہا
مناسب تھا دستور دنیا کے موافق اور حکم خدا کے موافق کہ سمجھت زیادہ نہیں اتنا اور
بہت نہیں اس قدر سمجھ لیتا کہ کوہار پتہ ہمیشہ رہنے والا اور زاہد حق سدا ٹھہرنے والی
نہیں۔ یہ سادوں کی چڑبا۔ برسات کا چھینٹا۔ صبح کی چاندنی اور ریت کی چمک ہے۔ وقت
آ رہا ہے کہ یہ اس گھر کو ترسیگی۔ اور میں نہیں تو میرے گھر کا کوئی نہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر
اس کی صورت کو دیکھے گا۔ اور نظر آئے گی۔ میں کہاں اور یہ کہاں۔ یہ بھی وقت کی
بات اور محض اتفاق ہے کہ میرے غصے کی نظریں اور تیوری کے بل دیکھ رہی ہے۔
اور سہہ رہی ہے۔ مگر سمجھتا تو اس وقت جب دماغ صحیح اور عقل درست ہوتی۔ خبر
اس کا بھی مضائقہ نہیں اس دنیا اور اس جہان میں عقل مند بھی جیتے ہیں۔ بیوقوف بھی

سہیلار بھی رہتے ہیں۔ مریں بھی۔ مگر یکجہت تو بیوقوف اور سہیدوہ ہو کر رہیں اور ہر حال میں اپنے تئیں عقلمند اور لائق سمجھتا تھا اس کو شاہدہ کی محبت تھی۔ اور محمد علی نہیں بہت زیادہ۔ مگر اس میں بھی صداقت نہ تھی وہ صرف اس توقع پر اس کا فریفتہ تھا کہ یہ میری مرضی کے موافق اور خواہش کے بموجب تہذیب کا مخزن اور شہرت کا معدن ہوگی۔ بہر حال کیفیت یہ تھی کہ ایک آنکھ میں ہر بہر ایک آنکھ میں خدا کا قہر۔ شاہدہ علی الاعلان کھلے خزانے جو چاہتی وہ کرتی۔ جو جی میں آتا ہستی مگر اُٹ نہ کرتا۔ جب رئیس البیت بھی بھلی اور بُری سب دیکھتا اور جائز سمجھتا تو ناجائز سمجھنے کا حق کس کو اور نوکنے والا کون شاہدہ جو کچھ بھی کرتی کم تھا پردے کی پروا سے نہ تھی بزرگوں کا ادب اسے نہ تھا۔ اور پھر لطف یہ کہ ماسے لے کر بہن تک اور بڑے سے بیکر چھوٹے تک سارے گھر کو جاہل اور دنیا نوسی سمجھتی تعلیم۔ تربیت۔ محبت کچھ تین چیزیں تھیں جنہوں نے اس کو مغربی سائے میں ڈھالا ان پر طرہ بابا کی داد تھی۔ کہ ہر قول کو اور ہر فعل کو سر پر رکھتا اور ٹھکوں سے لگانا وہ ماں کے منہ درمنہ اور بہن کے سامنے ڈنکے کی چوٹ دونوں کو جاہل باقی اور بیوقوف کہتی۔ ماغریب کے فرشتوں نے بھی اس ڈھنگ کی لڑکی دیکھی نہ سنی۔ جلتی جھلستی انگاروں پر لوثی اور آگ میں جھنپی۔ مگر جانتی تھی کہ سمجھنا بچھانا تو درکنار آدمی پتا بھی زبان سے نکالوں گی تو پیچھا چھڑانا شکل ہو جائے گا۔ ایک کہوں نہ چار سنوں ہم اس معاملہ میں قطعاً ساجد کا کوہِ عیب سے پاک اور ہر نقص سے دور رہ سکتے ہیں۔ آخر شاہدہ بھی تو اسی کی بچی تھی۔ اُسی گود سے اُٹھی اُسی دودھ سے پی مگر دونوں میں زمین آسمان کا فرق اور مشرق و مغرب کا بُعد تھا۔ تمام ذمہ داری اور ابتداء اتنا انتہا اسی بد نصیب باپ پر ہے جس نے غیروں کی طرح آنکھوں پٹھیکری رکھ ایسا کانوں میں تیل ڈالا کہ رتی بھر پردہ نہ کی۔ جوان قریب قریب نول ہی ہو چکی

نہیں۔ اب دونوں کا کواری پتہ ماں کے واسطے پوری مصیبت تھی۔ وہ لاکھ شاہدوں سے بے تعلق تھی۔ مگر ماتنا کا کیا علاج کرتی۔ کہ صرف اس خیال نے کہ عمر میں دھل رہی ہیں اور بر نہیں جڑتے اس کو کھانا پینا سب حرام کر دیا۔ رات اسی چکر میں ختم اور دن اسی اوجھڑ میں پورا ہو جاتا۔ دو چار دفعہ میاں کو بھی متوجہ کیا مگر وہ بجائے اس کے کہ بیوی کے بیچ میں شریک ہو کر یا کوئی اور معقول بات کہہ کر اس کو تسکین دیتا۔ جب بولا اَللّٰہ اور جو جواب دیا اوندھا۔ اور آخری فیصلہ یہ کیا۔ کہ ”تم شاہدوں سے بے فکر رہو۔ اپنی بچی کا انتظام کرو اس کا بھی ہو جائیگا۔ خدا کا شکر ہے روپیہ کی کمی نہ تھی۔ عزت بھی تھی اثر بھی تھا۔ ایک خرابی بی مخلاتی کی تھی۔ تو روپیہ کے آگے ہڈی کو کون پہچھتا ہے۔ دولت نے اچھی طرح چھپا دیا۔ بات نہ کہنے یا شادی نہ ہونے کی وجہ اور تھی اور معقول تھی۔ بی شاہدوں کے گن چھپے ڈھکے اور میاں کے کرتوت ایسے ویسے نہ تھے۔ ایک دنیا میں شہرت اور ایک جہان میں ڈبکا چکا تھا۔ بچارے اگلے زمانہ کے سیرھے سارے تو اس کا نام آتے ہی کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے کہ زمانہ نے اچھی طرح بتا اور وقت نے پوری طرح سمجھا دیا تھا کہ یہ نقشہ جدید کی منوالیاں تقلید غیر میں اتنی شرابور اور ایسی چکنا چور ہیں کہ میاں کو لنگھتی بندھوا بھی نہ چھوڑیں گی۔ یہ بارہ مہینے کی روگی۔ تیس دن کی بیمار۔ کام کی پہنیں۔ کاج کی یہ نہیں۔ سچے اس رنگ کے شیراُن کی خواہشیں بڑھی ہوئی۔ تمنا میں پھیلی ہوئی۔ حُسن کے متلاشی، دولت کے جو یا تعلیم کے خواہاں، سلیقہ کے آرزو مند ان کو کیا غرض پہڑی تھی کہ جیسا تک پورا مقابلہ نہ کر لیں اور دس پانچ کو ذلیل، دو چار کو حقیر ایک آدمہ کو جاہل نہ بنادیں شادی پر آمادہ ہو جائیں۔ بی شاہدوں کا نام شہر میں پوری طرح روشن اور اچھی طرح اچھل چکا تھا۔ اور ابھی تک ایسے بڑھے ٹھڈھے موجود تھے جو مٹی سی بات پر رقتہ واپس کر دیں کہ جیانی ہم کوٹ پتکون کی عزت کے قابل نہیں

اب ان کی کھپت ہو سکتی تھی تو اپنے ہی رنگ میں۔ اب چاہئے تو یہ سمجھو کہ ایک مچھلی نے سارا جل گندہ کیا چاہئے یہ کہ جنے کے ساتھ گھٹن بھی پسٹا، شاہد کے ساتھ زاہد کا پر بھی مصیبت آئی کہ اس کا پیغام بھی اڑ گیا۔ سیاں کا جواب سن اور زامی کی کیفیت دیکھ چاہئے تھا کہ ماں غاموش ہو جاتی یا ان فکروں سے چٹھکا رپاتی جوں جوں دن بڑھتے جا رہے تھے۔ اس کا سہم ترقی کر رہا تھا۔ حصن حصین کا ختم یا سمیچ کا چلہ دونوں پورے کر لئے۔ مگر بات بڑی کی آئی نہ چھوٹی کی۔ پرنسپل کو ایک آدھ دفعہ نہیں دوچار دفعہ اور فقط اپنوں ہی سے نہیں غیروں تک سوسٹہ پھونک کر کہت پڑا کہ بچیوں کا خیال رکھنا۔ مگر شاہد کچھ ایسی بدنام ہو چکی تھی کہ کوئی حامی ہی نہ بھرتا تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ رحیم شاہد کی داروغہ، حساب کتاب کی فٹنار سالن گرم کرنے آگ کی بھری انگلی سے آ رہی تھی مگر یہ کام موسم تھا۔ چوکھٹ پر چڑھتی تھی کہ پاؤں رپٹا اور دھڑام سے گر گئی۔ سفید چادر لال غالیچے، ریشمی پردے، سب بھرتے ہوئے۔ کہنیوں تک دونوں ہاتھ منہ ٹھوڑی سکھ سب کی چربی نکل آئی۔ جب جا بڑھیا تو نہ تھی۔ مگر پیس کا پٹیا ضرور تھا۔ خاصی شریف خاندان کی عورت اور ایک اوسط درجہ کے شوہر کی بیوی تھی۔ گر پے در پے موتیں اور متواتر مصیبتیں کچھ ایسی آ کر پڑیں کہ پلنگ پر درسی تک نہ رہی۔ ایک کرٹیل بیٹا مرا۔ ایک جوان بیٹی گئی۔ مازندہ تھی وہ پھونس۔ بھائی موجود تھا وہ دیوانہ چار ساڑھے چار برس سے یہاں کام کر رہی تھی۔ کل کا دن یا سکھ کی رات تو ایک گزرا نہ گزری ہر وقت کل کل اور پٹ پٹ تھی۔ اُو گدھی بات بات میں چور بے ایمان۔ مگر پیٹ بڑی بلا ہے۔ اُٹھاتی جو پڑتی اور کھلتی جواتی۔ شاہد کے دربار میں تنا بڑا واقعہ اتنا سنگین جرم اتنا عظیم تصور مصیبت تھی آفت تھی۔ تیامت تھی۔ بڑھیا جو ایک آدھ دفعہ پٹ بھی چکی تھی آج موت کا یقین کر بیٹھی۔ آگ تو خیر دوسری مادوں سے آکر بجھائی مگر شاہد کو صبر کہاں۔ اُٹھی جو منہ میں آیا کہا اور سنا یا۔ مگر یہ کافی نہ تھا۔ ایک لات ایسی ہی

کہ انگلیٹھی پر جا کر گری اور ٹھیلے ہوئے چہرے سے خون نکلنے لگا۔ اس وقت تو بات گئی گذری ہوئی۔ مگر رات کو اپنے گھر پہنچی تو دلنا دو پھر تھا۔ یہی شاہد کو جیتے یہ معلوم ہوا تھا کہ کھانا دیوانے بھائی کو کھلاتی ہے۔ تو یہ اہتمام کیا تھا کہ پیس سے کھاپی خالی ہاتھ جائے۔ یہاں سے جا کر دیوانے بھائی کا کھانا پکاتی۔ آج گئی تو بدن چور تھا۔ اور آگ میں جل رہی تھی۔ مگر اسی حال میں گرتی پڑتی اٹھی آنا گودھا روٹی پکائی کھلا چکی تو لیٹی مگر نیند کہاں ساری رات یہ معلوم ہوا کہ انگاروں پر لوٹ رہی ہے صبح حکیم کے ہاں گئی نسخہ لکھوایا۔ پیس پاس نہ تھا۔ تین مہینے کی تنخواہ شاہد پر چڑھی ہوئی تھی۔ سوچا کہ تنخواہ لے آؤں اور علاج شروع کر دوں۔

..... یہاں آئی تو میٹھا بھی شکل تھا۔ بڑی شکل سے ڈول میں بیٹھ ہائے کرتی آئی۔ کچھ کہنے بھی نہ پائی تھی کہ شاہد ۵ صورت دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئی اور چوڑے سے نیچے اتر کر کہنے لگی۔
 ”یہ فیلسوفی کس بات کی ہے تو کس کے حکم سے آج غیر حاضر ہوئی؟“
 ”جیسا“ آپ میری حالت دیکھتے ہیں کام کے قابل ہوں۔“
 ”شاہدہ“ حالت میں کیا ہے۔ اگر کام کے قابل تو نہیں ہے۔ تو اپنا عیوض دیا ہوتا۔“

”جیسا“ میں بیگم کس کو لاؤں؟
 ”شاہدہ“ آہستہ بات کر۔ گسٹنخ پرنیز۔“
 ”جیسا“ میری تنخواہ دیدیکھتے تو دووا فی ٹھنڈائی کر دوں۔“
 ”شاہدہ“ تنخواہ ضرور ضرور دیا رکھو۔ ہرگز تنخواہ نہیں مل سکتی۔ کام کر دو اس کے بعد تنخواہ مانگو۔“

”جیسا“ بیگم میں تو مر رہی ہوں کام کیا خاک کر دوں گی۔“

شاہدہ - ”پھر گستاخی کا بات۔ اُو کا موافق بات مت کرو۔ بھل جاؤ۔“
رحیمہ - ”بگم میری ننھا دے دو میں چلی جاؤں۔“
شاہدہ - ”بگم مت پہلے عوض حاضر کرو۔ اس کے بعد ننھا کا درخواست کرو۔ جتنا نقصان ہوا وہ سب کاٹ جائے گا۔“

رحیمہ - ”آپ ایک کوڑی نہ دیکھئے۔ میں عوض کہاں سے لاؤں۔“
شاہدہ - ”تمہارا بھتیجی موجود ہے۔ اس کو بھیج دو کام کرے گا۔ تم ہرگز نہیں جانے کا جب تک وہ نہ آئے۔“

رحیمہ - ”بیوی میں تو بڑھیا تھی۔ برقع سر پر ڈال لیا۔ سیانی تھی کو کیسے باہر نکال دوں مجھ پر تو پڑی تھی نوکری کر لی۔ اس کو کیا غرض جو وہ نکلے۔“
شاہدہ - ”وہ نہیں نکلے ایکوں نہیں؟“

رحیمہ - ”بیوی عزت بھی آخر کوئی چیز ہے یا نہیں۔ آخر میں تو اسے بچنا ہے۔ کیسے باہر نکال دیں۔“

شاہدہ - ”تم عزت دار ہے۔ اُو اچھا تم کو عزت دے گا۔ تم مت لاؤ اسکو،
رحیمہ - ”بیوی ذرا تو زبان سنبھال کر بولو۔ میری جان نکل رہی ہے آپ
 ننھا دیتی ہیں دیں نہیں تو میں چلی جاتی ہوں۔“

شاہدہ - ”چپ رہو اُو تم نہیں جاسکتا۔ ہم ابھی تمہارا علاج کرتا ہے۔“
رحیمہ - ”بڑھیا بڑھیا کو ننھا کا ملنا تو درکنار خالی جانا بھی امرت ہو گیا۔ ارادہ کیا تو شاہدہ نے زبردستی پکڑ کر بٹھالیا اور حکم دیا کہ بلا اجازت یہاں سے سرکی تو سمٹ سزا لے لے گی۔ ادھر اس کو بٹھایا اور ہر آدمی کو بچھڑتی کو بلا بھیجا کہ رحیمہ بڈا رہی ہے۔ منیرا آئی تو اس کی صورت دیکھتے ہی رحیمہ بیتاب ہو گئی اور کہنے لگی ”کیوں آئی۔“
منیرا - ”تم ہی نے تو بلایا ہے۔ آدمی کیا تھا۔“

بہرہ۔

رحیمؑ بڑی سگیم آپ ہی لاشہ فیصلہ کیجئے۔ بھلا کسی کی کواری بچی کو اس طرح بلا لینا اچھی بات ہے۔ ہم غریب سی۔ فقیر سی۔ مگر اپنی عزت تو رکھتے ہیں۔ ہاتھ بچا ہے ذات تھوڑی سی ہے۔ دیکھتے تو سی۔ منیرؑ کو بلا لیا۔

شاہدہؑ۔ ”گدھے کی بچی عزت دار کی جو روچھپ رہی۔ ہم تنخواہ دیں گے مفت کام نہیں لیں گے۔ تنہا فرض ہے کہ تم مرنا ہے تو اپنا عیوض دو۔ تنہا ہی موت ہم کو تکلیف نہیں دے سکتی۔“

یہاں تک بھی مضائقہ نہ تھا۔ اس کے بعد شاہدہؑ کا غصہ اور تیز ہوا اس نے فوراً رحیمؑ کو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ بخار میں ہلکا ہلا سی تھی۔ چوٹ میں مری تھی۔ مگر اپنی بیماری اور موت دونوں بھول گئی۔ چلتے لگی تو بھتیجی کا ہاتھ پکڑا مگر پیچھے سے ایک اس زور کا دوشتر پڑا کہ آنکھیں کھلی گئیں۔

”گدھے کی بچی یہ نہیں جاسکتی جب تک دوسرے آدمی کا انتظام نہ ہو جائے۔“
رحیمؑ۔ ”سگیم ذرا انصاف نہ تو کیجئے میرا کس طرح سبانی بچی کو آنکھ سے اوجھل کر دوں۔“

شاہدہؑ۔ ”نہیں نکل جاؤ۔ ابھی منکلو۔ ہم دوسرے آدمی کا انتظام کرتے ہیں جس وقت آگیا اسی وقت اس کو نکال باہر کریں گے۔ پیار باہر جاؤ منکلو منکلو ابھی چلو چلو فوراً غارت ہو بڑھو آگے بڑھو۔“

رحیمؑ روتی ہوئی باہر نکلی۔ اس خیال سے کہ شاہدہؑ کو کچھ تصفیہ کرے۔ اس کے پاس مردانے ہیں پہونچی۔ مگر وہ بچلے مانس بھی تو شاہدہؑ کا باپ تھا۔ ساری کتھا سن چکا تو کہنے لگا ”اس صاحب کے انتظام میں ہم کو دخل کی ضرورت نہیں۔“
مایوس ہو کر پھر گھر میں آئی تو شاہدہؑ نے دوسری عورت کو بلا کر کہا یا خفا منیرؑ کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور جب تک ہم حکم دیں اپنے پاس کھوئے حکم کی تعمیل میں کیا کر

ہو سکتی تھی۔ منبر احمدیہ کے ساتھ روتی ہوئی جا چکی تھی۔ چاروں طرف دیکھا ہر ایک سے پوچھا۔ کتنی سنتی پھری روتی گڑ گڑاتی پھری مگر کس کی مجال تھی کہ شاہد کے مسائل میں دم مار سکتا۔ یہ گرمی کا پہاڑ سادہ کیسی دوائی اور کس کی ٹھنڈائی پانی کے دو گھونٹ بھی نصیب نہ ہوئے۔ زلزلہ اور ماں و فوں شاہد کا غم دیکھ بھی رہے تھے اور رحیمہ کی بے گناہی پر کلچہ بھی کٹ رہا تھا۔ مگر اتنی ہمت نہ تھی کہ شاہد سے تو کیا رحیمہ سے بھی بات کر لیتے۔ شام کے وقت زلزلہ اور ماں عصر کے نماز سے فارغ ہوئے تو شاہد تھا تو شاہد تھا دھوکہ کلب کے واسطے کہڑے بدل باہر آئی۔ ہاتھ میں ٹینس کا بال تھا۔ رحیمہ کو حکم دیکر کہا:-

”تم مگر لوگ اتنا نہیں خیال کرتے کہ کسی کو تکلیف دینے کا نام کو حق کیا ہے تم بیمار ہے تو اچھا بات ہے اتنے روز منبر کو کام کرنا چاہیے۔ اگر اس سے پہلے ہم کو آدمی مل گیا تو ہم اس کو چھوڑ دے گا۔“

رحیمہ:- ”بھلا بیوی ذرا انصاف سے بات کرو جو ان بچی کیسے ایسے

چھوڑ دوں خدا کے واسطے بناؤ تو سہی وہ ہے کہاں؟“

شاہد چلی گئی تو رحیمہ نے حسرت سے اس کی ماں کی طرف دیکھا جب

وہ بھی خاموش رہی تو باہر آئی۔ مغرب کی آذان ہو رہی تھی کہ شاہد واپس

آئی اور حکم دیا ”اس بڑھیا کو ابھی نکال دو۔“

نکلی، چلی، گھر پہنچی بخار تیز تھا۔ جسم بھنا جارا ہوا لیٹی مگر نہ لیٹا گیا۔ اٹھی

کھڑی ہوئی کلچہ میں پھر ہوک اٹھی اور اسی طرح تڑپتی تڑپاتی آئی۔ شاہد

آرام کر سی پر لیٹی تھی کہ رحیمہ نے گڑ گڑا کر کہا:-

”بیگم خدا کے واسطے غصہ نہ کرو کہ وہ دوا اور ٹیبلٹ پر دم کر دیں نے اتنے دن

آپ کی خدمت کی ہے آخر کچھ تو میرا بھی حق ہے مجھ پر اگر کوئی مصیبت آتی تو آپ ہی کے

پاس پہنچتی۔ آپ خیال تو کیجئے کہ آخر جو ان بیٹی کو کوئی بھی آنکھ سے ادھیل کرتا ہے سیکم کواری لڑکیوں کی ابرو تو موتی کی سی آب ہے۔ آپ دیکھ رہی ہیں کہ کیا وقت جا رہا ہے۔ دوپہر سے بچی مجھ سے چھوٹی ہوئی ہے۔ میں تو سیکم اپنا بھار بھی بھول گئی۔ اللہ اپنے اما باؤ کا صدقہ، بہن بھائیوں کا صدقہ، مجھ پر رحم کیجئے اور بتا دیجئے کہ میری بچی کہاں ہے۔ اگر کہیں اور بھیج دیا ہے تو میں گرتی پڑتی وہیں پہنچوں گی اور اس کو لاؤں گی۔“

شاہدہ۔ ”میں اما کی طرح سیدھی اور زارھلا کی طرح بیوقوف نہیں ہوں کہ اس نفاق میں آ جاؤں۔ میں نے جو بات سنی وہ کہہ دی۔“
رحیمہ۔ ”بس تو میری میں تھانہ میں جاتی ہوں۔“
 اتنا سنتے ہی شاہدہ آپ سے باہر ہو گئی۔ بلا اٹھتا تو لڑا لڑا ایسے مارے کہ بڑھیا ہلک گئی۔ اور روتی ہوئی بھاگی۔

شاہدہ نے اتنی ہوشیاری اور کی تھی کہ چلتے وقت منیرا کے ہاتھ میں ایک سونے کا چھلا ڈال دیا تھا۔ بچی تیرہ برس کی جان کبھی بھولے سے بھی رات کو چھو بھی سے جڈانہ ہوئی۔ ذرا چراغ جل جاتے تھے تو غریب کو ایک ایک لمحہ ایک سال ہو جاتا تھا۔ اب جو اس دھوکے میں پڑ جیلا کے ہاں پہنچی تو اس کا لڑکا شرنی کبابی، جاری ڈھنڈاری، نشہ میں دھت، نالائق میں مست، منیرا کو دیکھ لگا۔ ہلکی ہلکی باتیں کرنے۔ بچاری کو سنا آگیا، کچھ دیر تو چپکے بیٹھی رہی اور پھر سیدھی اٹھ دروازہ کھول، گھر سے باہر آ جہر منہ اٹھا ہولی۔ رات کا وقت عورت ذات، بازار سے ناواقف، محلہ سے بے خبر، چاروں طرف ڈھونڈھتی پھری۔ خاک پتہ

نہ چلا۔ کہیں ادھی رات کے قریب پوچھتی پوچھتی گھر پہنچی تو چھو بھی بن نصیب دروازہ کھولے، یہوش پڑی تھی۔ آکر ہتھار کیا۔ بڑی شکل سے آنکھ کھلی تو گھر آکر

از علامہ راشد الخیریؒ
 اٹھلی۔ بھتیجی کو گلچہ سے لگایا اور اتنا روئی کہ پھر غش آگیا۔ رحیمؒ کی حالت
 لمحہ بہ لمحہ ردی ہو رہی تھی۔ بڑی شکل سے کہیں ڈیڑھ گھنٹہ میں ہوش آیا۔
 تو پانی مانگا اور کہا :-

”خدا کے واسطے منیرؒ میرے منہ اور ہاتھ میں لکڑیاں جل رہی ہیں
 ان پر پانی ڈال دے۔ بلا سے ذرا نوٹھنڈک پڑے۔“

منیرؒ نے پانی ڈالا تو ذرا جان میں جان آئی۔ صبح ہو چکی تھی۔ دیوانہ ایک
 دن اور ایک رات کا بھوکا اول جلول بک رہا تھا کہ دروازہ پر دوسپاہی
 اور ایک دفعہ درآموجود ہوئے اور دروازہ اندر گھسے چلے آئے۔
 ”منیرؒ! تیرا نام ہے یہ چھٹا تو خیر نکل آیا، بٹن کہاں ہیں؟“
 ”منیرؒ! چھٹا کیسا؟“

دفعہ دار:- ”چوری اور سر زوری! مال موجود چور موجود۔ اس کے باوجود
 تو پوچھتی ہے بٹن کیسے؟ مس صاحب کے بٹن اور چھٹا تم دونوں لیکر جا گئیں
 بٹن سیدھے ہاتھ سے ادھر دے۔“
 ”منیرؒ! اجی ہم تو چور نہیں ہیں۔ یہ ہمارے ہاتھ ہیں مس صاحب! بٹن
 تیر دوستی پہنا دیا تھا۔“

دفعہ دار:- ”ہاں ٹھیک ہے۔ چل ہمارے ساتھ آ۔ تو بھی کھڑی ہو
 ری۔ ادھر چل۔“

آگے آگے بیمار اور پیچھے پیچھے مردہ رحیمؒ! اس کے ساتھ معصوم اور
 سیدھی سادھی تھیلاؤ ان کے پیچھے سپاہی اور دفعہ دار۔ سب مل کر تھکاتے ہوئے
 تھوڑی سی کھا پڑھی ہوئے دونوں پھوپھی بھتیجیاں حوالات کر دی گئیں۔
 اس واقعہ کی تیسری رات تھی۔ دو بج رہے تھے۔ احاطہ حوالات کے

ہرست نحوشتی چھائی ہوئی تھی۔ پیپل کے سنبڑے اور گلابی مائل کوہلیں ان دونوں بیگناہوں پر حسرت کے آنسو گرا رہی تھیں۔ وقتاً درجیما کی طبیعت زیادہ بگڑی اُس نے منیرا کو اپنے پاس بلا کر کلیجے سے لگایا اور کہا:-

”میرا اب آخر وقت ہے۔ زندگی کی امید نہیں میرے بعد خدا کے سوا تیرا کوئی وارث نہیں۔ مقدمہ کا نتیجہ جو کچھ ہو گا۔ تقدیر کا لکھا ہے مٹنے والا نہیں۔ خدا اس صاحب کا بھلا کرے۔ آہ میری محنت کا بدلہ، میری خدمت کا سلوک یہ ہی تھا۔ خیر خدا اُن کو خوش رکھے۔ میں نے ان کا نمک کھایا ہے۔ بددعا نہ دوں گی۔ اب میری آواز نہیں نکلتی۔ پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں تھوڑا سا پانی اگر مل جائے تو ٹپکا دے۔“

پھوپھی کی گفتگو سُننے ہی منیرا بیتاب ہو گئی۔ اس کے قدموں میں گر پڑی اور کہنے لگی:-

”اس حالات میں۔ میں بے گناہ گرفتار ہوں۔ پھوپھی جان خدا کا واسطہ یہاں میرا ساتھ نہ چھوڑو میں نہ معلوم کیسی تقدیر لے کر آئی تھی۔ کہ میری وجہ سے آپ پر بھی مصیبت آگئی۔ پانی کہاں سے لاؤں؟ گھر خالی پڑا ہے۔“

رحیما:- ”ہائے بچی بدن بھلا جا رہا ہے خدا کا واسطہ پانی۔“

منیرا:- ”اے بھائی میرے والے تھوڑا سا پانی دیدو۔ میری پھوپھی کی حالت بہت خراب ہے۔“

پہرے والا:- ”تجھ کو یہاں چھوڑ کر دو کوں پر پانی بھرے جاؤں کہ تو بھاگ جائے۔“

رات مریض پر تڑپتے تڑپتے اور ہکتے ہکتے صبح ہوئی۔ آٹھ بجے کے

قریب کو تو ال صاحب آئے لمزموں کو دیکھا اور رحیما سے پوچھا تو اس نے کہا:-

” ہم دونوں بھوکے پیٹ بھینچیاں چور ہیں۔ یا نہیں خدا ہی اس کا فیصلہ کرے گا۔
 ہاں تقدیر میں جو رسوائی ہونی تھی وہ ہو گئی۔ یہ میری جوان بچی گھر چھوڑ قیدیں آگئی۔
 ہم اپنے گھر میں رہتے تھے جو روکھی سوکھی خدا دیتا تھا کھاتے سٹتے۔ یہ خبر نہ تھی کہ
 قسمت یہ دن بھی دکھائے گی۔ اپنی تکلیف کا خیال نہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ ہماری
 آبرو برباد ہوئی۔ ہم برادری میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ اب اس بچی کو کون
 قیولے گا۔ جو ہم پر پرہیزی خدا دشمن پر نہ ڈالے۔ یہ بچی نہ لینے میں نہ دینے میں۔ اس وقت
 بیگناہ گرفتار ہوئی ہے۔ ہمارا قصور صرف اتنا ہے کہ ہم غریب ہیں۔ مفلس ہیں
 میں بیمار ہوں مر رہی ہوں ہم پر رحم کیجئے۔ خدا آپ پر رحم کرے گا۔“
 رحیمہ کی گفتگو سچی تھی۔ کو تو ال آدمی معقول تھا۔ بات سننے ہی نہ کو
 پہنچ گیا اور اسی روز دونوں کو رہا کر دیا۔

آکھواں باب

زاہرہ۔ ”ہاں آماجان نانی صاحبہ کے کچھ اور حالات بیان کیجئے۔ مجھے
 ننان کی باتوں میں بہت ہی لطف آتا ہے۔ ہم بد نصیب ہیں کہ ہم کو انکی ناریت
 تک نصیب نہ ہوئی۔“

مال۔ ”اے بیٹی کیا سنناؤں وہ باتیں خوابے خیال ہو گئیں وہ صورتیں
 خاک میں چھپ گئیں۔ مرنے والوں کے خیال سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اب وہ صورتیں
 کہاں؟ اب تو نئے نئے لوگ نئی نئی باتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ وہ اگلی باتیں دیکھنے
 میں آتی ہیں نہ سننے میں۔ جدھر دیکھو تھے دور اور جس طرف آنکھ اٹھاؤ انوکھے
 رنگ۔ وہ بیٹیاں ہیں نہ بایں وہ گھر والیاں ہیں نہ بیویاں۔ میرے تو دیکھ دیکھ کے
 اوسان اڑتے جاتے ہیں۔ دور کیوں جاؤں اور کو کیا کہوں۔ اپنا ہی گھر دیکھو اپنی ہی

پیٹ پر نظر ڈالوں۔ رحیم اس کے ساتھ جوہوئی ہے۔ میرے لہو بدن کے روکنے کے لئے ہو گئے۔ خبر نہیں بیچاری پر کیا گزری۔ میں تو اس کی صورت کو ترس گئی بھلا وہ بچی محصوم آس نہ پاس غریب لپیٹ میں آگئی۔

”راہدہ“ ہاں اماں۔ یہ تو بچہ کہتی ہو۔ میں بھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ جب وہ روٹی آئی ہے اور گھر کیاں پڑھی ہیں۔

مال۔ ”کوئی آج اسی گھر میں سنے لو کہ اور مائیں تو آئے ہی نہیں۔ اللہ نے اپنی اپنی جینیت کے موافق سب ہی کو دے دیے ہیں۔ اماں جان کے ہاں بھی کہ بیچاری غریب آدمی ہیں ایک ٹوٹی بھوٹی اینٹک پڑی ہوئی ہے۔ مگر بڑی بھوپھی کے ہاں نقش بنی ایسی آئی کہ مگر ہی نکلی۔ جوانی اور بڑھاپا سب کے سامنے اسی دہلیز پر کاٹ دیا۔ ڈیڑھ برس کی رانڈ ہوئی مگر اس آن کی عورت تھی کہ اس کا پتہ تک کسی دیکھتا نصیب نہ ہوا۔ نانی جان کے ہاں کا حال تو کیا سناؤں اللہ کا شکر ہے ان کے ہاں ایک چھوڑتین تین مائیں گھر میں اور دو ذکر اور ایک باورچی باہر تھے مگر وہ تو لوگوں اور اماؤں پر کیا موقوفہ ہی۔ محلے اور پڑوس تک کو عزیروں سے زیادہ سمجھتی تھیں آج کے زمانہ میں اگر وہ بوتیں تو یا تو یہ دنیا ان کو بیوقوف سمجھتی یا وہ اس دنیا کو دیوانہ ٹم کھی شادی بچہ ہو گا بھنگن سے بڑا اور بستی سے بھائی کر کے بات کرتی تھیں۔ ماما نے کسی

رشتہ کی عورت کا بچہ میکہ پال لیا۔ اور وہ مر گیا۔ بچہ برس دو برس کا نہیں پانچ چار مہینہ کا نہیں فقط چھ دن کی جان۔ گرمی کا یہ حال کہ چیل انڈا پھوڑے دو دن ماما نہیں آئی۔ تیسرے دن آئی تو اس سے یہ تک نہ پوچھا کہ تیرے منہ میں کسے دانستہ۔ اس پر غضب یہ کہ آپ چوٹے کے آگے بیٹھی روٹی ڈال رہی ہیں اور دم نکل رہا ہے اس نے اگر رونا شروع کیا تو آپ بھی روٹی چھوڑ چھاڑ اس کے ساتھ روتے بیٹھ گئیں۔ رشتہ کا ایک خالہ وحید سی تھیں یہ تو خبر نہیں کہ کیا رشتہ تھا۔

اور کس کی بیوی تھیں۔ مگر اتنا سنا تھا کہ ان کے ساتھ کی کھیلی ہوئی ہیں ہم
 بیٹھے کنویں میں وہ چھوٹی بارہ درسی چار آٹہ ڈولی کا فاصلہ کبھی جانا بھی ہوتا تھا
 تو چلتے چلتے آدھ آجاتی تھی۔ مگر ان خالہ و جیدی کی وضو داری یہ تھی کہ آندھی جائے
 میند جائے مگر ان کا جہہ کا پھیرا ناندھ ہو۔ ساتھ برس سے اوپر عمر تھی۔ مگر حال یہ تھا
 کہ جب تک وہیں بارہ مہینے لکڑی ہاتھ میں برقع سر پہ چلی آ رہی ہیں۔ تانی جان ہزاروں
 روپے کی آدمی تھیں۔ سسکے کے سسکے اشرفیوں کے بھرے پرٹے تھے مگر جمعہ والے
 دن دوپہر ہی سے ان کی راہ دیکھنے بیٹھ جاتی تھیں۔ خالہ و جیدی کی آن یہ کہ
 ایک آٹہ کاپاٹوں کا مٹھا پیٹھہ ہاتھ میں لیکر گئیں اور نانی جان کا شوق یہ کہ صورت
 دیکھتے ہی پکیں۔ اور دروازہ میں جا کر پاؤں لئے پھر کیسی گھل گھل کر اور بل بل کر گھنوں
 بانیں ہوتی تھیں کہ دیکھ کر بھی تعجب ہوتا تھا۔ مزایہ تھا کہ جب تک وہ بیٹھی رہتی
 تھیں ممکن نہیں کہ کسی دوسرے کام میں مصروف ہو جائیں۔ ہمارا بچپن تھا ہم کو
 ان کی صورت دیکھ دیکھ کر مہسی آتی تھی۔ ماموں جان نے ایک دفعہ اتنا کہہ دیا
 تھا کہ خالہ سے پیچھے باتیں کر لینا پہلے میرے کپڑے نکلوا دو۔ اس پر اتنی بگڑیں کہ
 تین دن تک وہی کپڑے پہنے اور چوہا سے پھرے۔ مگر انہوں نے کپڑے نہ دئے۔
 جب چوتھے دن قصور معاف کر دیا اور عہد کیا کہ آئندہ نہ کہوں گا تو راضی ہوئیں۔
 رشتہ نہیں، نانا نہیں، کنیہ نہیں، برادری نہیں۔ مگر چھوٹے سے بڑے تک سب کا آئندہ
 خالہ خالہ کہتے خشک ہوتا تھا۔ ایک ان کے ساتھ کیا۔ ہم نے سب کے ساتھ ان کو
 اسی طرح ملتے دیکھا اور بات کرتے سنا۔

سمیعاً گھر کی لونڈی تھی۔ اس کی لڑکی پانچ برس کی مری۔ رات بھر مریے کو
 کلیجہ سے لگائے بیٹھی رہیں۔ اس کا میاں اتنا نالائق تھا کہ شادی ہونے ہی طوطی کی
 طرح دبے دل گیا کبھی برسوں چھٹے مہینے ایک آدھ دن کو بھیجتا، مگر جب وہ بیمار

بچہ کو لئے ڈول سے روتی اتر رہی اور اُس کے میاں نے آکر کہا بیگم صاحبہ دیکھئے تو سہی یہ ڈنڈا کو کیا ہو گیا۔ تو اپنے ہاتھ سے بچہ کو اٹھا لیا اور کہا کہ اٹھو یہ خود دوا پیس کرو ورنہ دقت پلائی تھیں۔

میری آنکھیں جو سماں دیکھ چکی ہیں وہ اب نظر نہیں آسکتا۔ دل ان صورتوں کو نگاہیں ان چہروں کو اور کان ان باتوں کو تڑپا رہے ہیں۔ ترس رہے ہیں اور پھر دک رہے ہیں۔ میرے ماموں جان کی شادی ہے۔ دیکھیں انگنائی میں رکھی ہیں اور آپ مونڈھے پر بیٹھی کھانا تقسیم کر رہی ہیں۔

بجید ایک بن بابا کا بچہ نو دس برس کا ہو گا۔ پچاس روپے کی لہیب کی جوڑی ہاتھ میں لئے آیا اس کی بھی خطا نہ تھی اور نانا جان کو بھی معلوم نہ تھا۔ انہوں نے اہل میں جوڑی بھیجی تو کر کے ہاتھ اس پر قوت سے پہنچے تو دوچار آوازیں ماموں کو دیں۔ مگر شادی کا گھر۔ سچے ہاں ہم ہی تھیں۔ سنسنا کون تھا۔ اس کا اتفاق سے پہنچ گیا۔ ہاتھ میں دیدی۔ بچہ نام کا تو لڑکا تھا۔ مگر بچہ بچہ ہی تھا خوش خوشی سے آیا چوتھے پر چڑھ رہا تھا کہ باؤں رہا اور دونوں چھٹی سے گریسیوں ٹکڑے ہو گئے۔ نانی جان دنگ تھیں۔ مگر نانا جان کا غصہ بہت تیز تھا۔ سنسنا ہی آگ بگولا ہو گئے اور دلا کو پکڑ کر درانہ میں لے گئے۔ خدا جانتے اور ہم اس کو کہتے یا کھال اوجھڑنے اللہ نانی جان کو بخشے۔ مہمانوں کو چھوڑ کر درانہ میں پہنچیں اور کہتے لگیں۔

”صوبہ داس صاحب اس بد نصیب بچہ نے اپنی بیوی توئی سے دونوں لہیبیں تیل پڑنا تک نصیب نہ ہوا ضرور توڑے مگر جس دقت تم اس کا ہاتھ پکڑ کر چلے ہو اس وقت اس کی نظریں جن میں بیگنائی کا غم تھا تمہارے چہرے پر تھیں۔ میں اس وقت اس کے دل کی کیفیت دیکھ رہی تھی۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا۔ اس کی زبان خاموش تھی اس کی آواز نکلتی نہ تھی اور اس کی حالت اس وقت گائے کی سی تھی جو قصائی کے قبضہ میں تیز پھیری کو

دیکھ کر سہم رہی ہو۔ میں جانتی ہوں یہ مصدیم ہمارے پیٹ کی اولاد نہیں۔ مگر اس کی یتیم صورت، اس کی خاموش آنکھیں، چپ ہنسی اور اب بھی ہمارے رحم کی خواستگاری ہیں۔ یہ ایک مظلوم انسان اور ایک بیگناہ ہستی ہے جو اس وقت ہمارے قبضہ میں ہمارے بس میں ہے۔ ہم کو اختیار ہے کہ ہم ماریں پیئیں۔ سزا دیں۔ چھوڑ دیں۔ اس کے سر پر باپ کا سایہ ہے۔ نماں کی شفقت، اس کی تکلیف سے اس کی مصیبت سے باپ کا دل، ماں کی مانتا متاثر ہونے والی موجود نہیں۔ مگر آج وہ دن ہے جو ہزاروں اربانوں۔ سینکڑوں مندوں سے ہم کو میسر آیا اس خدائے برحق نے ہم کو یہ خوشی عطا فرمائی جس کی مخلوق اس وقت ہمارے رحم کی منتظر ہے اور جو خود ہماری حالت کا مطالعہ کر رہا ہے۔ صوبہ دار صاحب اس کے قبضہ میں کچھ نہیں سیر ہو کر چپ، سہلہ کر خاموش اور پٹ کر ساکت ہو جائے گا۔ مگر اس کی آنکھ کا ہر آنسو، اس کی آہ کا ہر حصہ بہت وزنی ہوگا۔ یہ بے بس کی فریاد اور بیکی کی شکایت ہوگی۔ اس سرکاری اور اس دربار میں جو ازلی وابدی ہے۔

صوبہ دار صاحب بہت نازک وقت ہے لہذا اس بچے کو کلیچہ سے لگا لیجئے اور اُدھر نگاہ اٹھا کر دیکھئے وہ آسمانی بادشاہت کا راج کریندا لا تخت حکومت پر نظر آئے گا۔ اس سے التجا کیجئے اور ہم سے آمین کہلوائیے کہ اپنے حبیب کے طفیل اپنے رسول کا قصد اس طرح ہمارے گناہوں کو معاف کرے اور ہم پر رحم کرے۔ ہم سب کو ٹھٹھے پر کھڑے یہ باتیں سن سہتے تھے۔ تانا جان بننے لگے تو اس کو خونخواری جان لے گلے سے لگا لیا اور ساتھ لے کر آئیں۔ پاس بٹھا لیا اور کھانا نکالنے لگیں۔ کچھ رات زیادہ آگئی تھی دہریں پڑ کر ڈھیر ہو گیا۔ رات کا ایک بج ہو گا کہ کھانا نکال کر خود کھا رہے بیٹھیں۔ بچہ کو جگایا پہلے اس کو کھانا کھلایا۔ کیا وقت تھا۔ بچہ کھانا کھا رہا تھا اور وہ اپنے ہاتھ سے اس کو پانی

دے رہی تھیں۔

کبھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی تھیں کبھی اس کو چمکارتی تھیں۔

جب بچہ کھانا کھا کر لیٹ گیا۔ اس کے بعد انگنائی میں آئیں۔ یہ خبر نہیں کیا۔
مگر گڑا کر دے مانگی اور پھر آکر خود کھانا کھانے بیٹھیں۔

نوال باب

جس طرح زاہد کی شادی کا اختیار از ابتدا اتنا ساجد کو تھا۔ اسی طرح شاہد کی شادی کے متعلق اس کی مجال نہ تھی کہ وہ دم مار سکے۔ رقعہ آیا۔ دیکھ بھال بات چیت کچھ نہ ہوئی۔ صرف ایک شام کو اتنا معلوم ہوا کہ کل شاہد کا نکاح ہے۔ ماں نے اتنا تو کہا ”کیا کہہ رہے ہو۔ مائیوں بھی نہ بٹھاؤ گے۔“ مگر جب یہ سنا کہ تم ان باتوں میں دخل نہ دو اور ایسی لغو رسم کا ذکر اب میرے سامنے نہ کرنا۔ تو خاموش ہو گئی۔

دوسرے دن سہ پہر کو مہمان آنے شروع ہوئے مگر کون؟ ماں کا ملنے والا ایک نہیں۔ باہر باب کے ملنے والے اور اندر رڑکی کے!

ایسی حالت میں غریب دخل ہی کیا دے سکتی تھی اور اس کی رائے کو پوچھنا کون تھا اور اگر ہماری رائے غلط نہ ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ ہوا اس کا بڑا حصہ خود وہیں کے مشورے اور سہیلیوں کی صلاح ہے۔

المختصر شاہد مسٹر حسن بن اور میکے سے ودارع ہو سہ سال جا پہنچیں۔ ایم ڈبلیو حسن ڈاکٹر نو نہ تھے۔ مگر ڈاکٹری کی تعلیم کیا اسے دودھ و لایت گئے اور دونوں دفعہ جیسے گئے ویسے آگئے خوشحال باب کا بیٹا تھا۔ روپیہ کی کمی نہ تھی۔ مگر سوا اس کے کہ نام مسلمانوں تھا شروع سے آخر تک اور گھر سے باہر تک کوئی

چیز اسلام کی نہ تھی۔ لباس۔ خوراک۔ رہنا سہنا۔ کھانا پینا۔ ملنا جلنا۔ بون چان
 غرض ہر فعل اور ہر قول مسلمانوں سے سینکڑوں کوس دور تھا۔ اور اسی پر بس نہ
 تھی۔ غضب یہ تھا کہ روزہ دار جاہل اور نمازی بیوقوف سمجھے جاتے تھے۔ قیاس
 یہیں تک ختم ہو جاتا تو خیر، لگے زمانہ کے سیدھے سادے مسلمانوں کا تو وہ مضحکہ اُڑتا
 تھا کہ خدا کی پناہ۔ بُرائیاں اُن میں ہوتی تھیں۔ بیوقوف وہ بنتے تھے، برباد سی قوم
 کا سبب وہ، جہالت کا باعث وہ، افلاس کی وجہ وہ، غرض کوئی عیب کوئی خرابی کوئی
 نقص اور کوئی بُرائی ایسی نہ تھی جو ان میں نہ ہو۔ یہ رنگ ہیں پچیس برس سے
 مشر حسن کے خاندان پر چھایا ہوا تھا اَلْجَنَّتُونِ لِلْجَنَّتِ خَدَائِیْ فیصلہ ہے۔ گاڑھے
 میں گاڑھے اور زریعت میں زریعت کا پیوند ٹھیک ہوتا ہے۔ میاں بیوی کے
 خیالات کی وہ میزان تھی کہ سبحان اللہ۔ آٹھ نو سو روپے ماہوار کرایہ جانداؤ کا
 تھا۔ دو سو سال گاؤں علیحدہ تھے۔ روپیہ کی کچھ کمی نہ تھی۔ بچے صرف دو حسین اور حسینہ
 اور دو میاں بیوی چار دم جن میں اب ایک اور بڑھ گیا پانچ آدمیوں میں ڈپرٹھ
 ہزار کے قریب آمدنی نہایت بے فکری اور اطمینان سے بسر ہوتی تھی۔ چار ماہیں دو
 چھوکر یاں۔ اندر خانساں۔ باہر سائیس اردلی۔ خرپوزے کو دیکھ کر خرپوزہ
 رنگ پکڑتا ہے۔ ماؤں کا یہ حال تھا کہ چھو کر بھی دروازہ پر آتی تو کہتی کُسا ئیس
 سے بولو گاڑی کھینچے۔ اب شاہد کی روزانہ زندگی یہ تھی:-

آٹھ بجے کے قریب سوکر اُٹھتی۔ ہانگ پر بیٹھے بیٹھے چائے کی پیالی اور دو
 انڈے کچھ توس کھاتی۔ اس کے بعد غسل خانہ جاتی۔ نہادھو کر باہر آتی۔ بال بنواتی
 کپڑے پہنتی اور ڈاک دیکھتی۔ کھانا کھاتی۔ اخبار پڑھتی۔ سو جاتی۔ اُٹھ بیٹھتی۔
 منہ ہاتھ دھوتی۔ لنگھی کرتی۔ کاب جاتی آتی۔ اخبار پڑھتی۔ کتاب دیکھتی۔ باتیں کرتی سو جاتی۔
 دوڑھاتی سال تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ ماسے نام سے تو اُس کو ہمیشہ

نفرت رہی اور ماں کے ساتھ ہی زراہٹ دشمن تو نہیں۔ مگر کچھ ایسی دوست بھی نہ تھی۔ ہاں سو غفلتِ روں کا غفلت مند اور دانا دل کا دانا وہ باپ تھا جس نے بیٹی کو اپنا دیوانہ بنا دیا۔ ہفتہ میں ایک دوسرے اس سے ملنے کو اہتہ آجاتی اور دنیا دکھاوے کی شرم یا پیٹ میں رکھنے کا لحاظ جو کچھ بھی تھا۔ کھڑے کھڑے ماں کو بھی صورت دکھا جاتی ورنہ وہ بیسکے کے نام سے تنفر اور صورت سے بیزار تھی۔ حد یہ ہے کہ دو برس شادی کو ہو گئے۔ وہ کھسک بھلی بری صحت علالت سب کی طرح سے گزری مگر اس نے ایک دن کیا ایک لمحہ کیوسلے مایا بہن کا آنا اپنے گھر پر گوارا نہ کیا۔ یہاں تک کہ ایک چھوڑ دو دوزخہ خانے ہو گئے۔ پہلا کچھ خالص آٹھ روز زندہ رہا۔ پیدا بھی ہوا مگر ابھی۔ مگر جینے میں یا مرنے میں ماں نہ آسکی۔ گھر بیٹھے بیٹھے مات کی ماری ہر چند بلی اور تڑپڑائی۔ مگر وہاں جانے کی اجازت نہ ملی۔ اس لئے کہ معقول پرٹھے لکھے شریف مشیار سمجھ دار آدمیوں میں جاہل پھوٹو خوشی نالائق آدمی کے جانے سے سوائے برنامی کے کیا حاصل۔ دوسرا بچہ نرس کے طفیل نانی کے ہاں آجانا اور دونوں دیکھ لیتیں مگر دوسرے کیونکہ ایسا ہو کسی کی بری عادت کچھ پرائز ڈال دے یہ کچھ جس روز سے پیدا ہوا اس روز ایک نرس کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ تعلیم جدید نے جہاں دنیا کو سول سے بہت سے نقص دور کئے ہیں وہاں دودھ بھی ماؤں کے سینے سے خشک کر دیا ہے کہ بھیر بکری کا شیوہ ہے۔ پھر بھلا شاہد کسے واسطے اس سے زیادہ کسر نشان کیا ہوئی کہ وہ کلب میں بیویوں کے سامنے بچہ کو گود میں لئے چھاتی سے لگائے بیٹھی ہیں اور بچہ چُسر چُسر کر رہا ہے۔ بچہ ابھی پیدا بھی نہ ہوا تھا کہ اتنا مقرر ہو گئی۔ گو وہ نوم کی ایسی ہی کوٹھن چارہ تھی۔ مگر گھر والوں کے یہ ختنے دیکھ سمجھ گئی کہ نبھا ر شکل ہے۔ اس سے پہلے کلکٹر صاحب کے بچے کو دودھ پلا چکی تھی۔

ایک ہفتہ کا نوٹس دے ٹھیک ساتویں دن سبکے سلسلے بچہ کو چھوڑ سیدی

ہولی بہتیرا حسن اور شاہدِ ممت خوشامد کرتے رہے۔ مگر اس نے خاک نہ سنی
آخر شاہد اپنی اگلی طبیعت پر آئی اور کہنے لگی۔

”ہم تم کو پولس میں بھیج دے گا۔ ہمارا بچہ بھوکا مرے گا۔“

اتنا ”ایسی ایسی پولس میں بھیجنے والیاں بیسیوں دیکھ لیں ہم نے اسی
واسطے نوٹس دیا تھا اور تم سے پہلے پولس میں رپورٹ اور میم صاحب ذکر کر دیا ہے۔“
اب اس کے نقلی میم صاحب کیا بول سکتی تھیں وہم ہی تو ہو گئیں اور اتنا اپنا ستر
سنبھال سیدھی ہوئی۔

اتنا کے جاتے ہی میاں بیوی، ساس، سہیلی سب ہی کے چھٹے چھوٹ گئے سوچا
یہ تھا کہ جا کہاں سکتی ہے بجتی ہے کہنے دو۔ یہ خبر نہ تھی کہ اتنا بچ کی میم صاحب
چاروں طرف تلا توپ ڈالی، نوکر چھوڑے۔ مائیں گئیں۔ ہر سمت تلاش کیا۔ ایک ایک
سے کہا۔ لیکن اتنا بازار کی مٹھائی تو تھی نہیں کہ مول آ جاتی۔ بارہ گھنٹہ کا دن صاف
آنکھوں میں کٹ گیا اور چہرہ ہینہ کا بچہ بھوکا پیاسا دودھ کو بلکتا اور اتنا کو ترستا
رہا۔ تعلیم یافتہ گروہ میں سے تو کوئی کام نہ آیا۔ ان کو ضرورت نہیں کہ مدد کریں نہ کسی کو
حق کہ تکلیف دے۔ ہاں ماں نے جیسے یہ خبر سنی۔ مچھلی کی طرح ترپ گئی۔ جب شام
تک کچھ انتظام نہ ہوا تو زاہد سے کہنے لگی ”بیٹی لائیں ماں کے ہاں ہواؤں۔ وہاں
شاید کوئی اتنا لجاے۔“ زاہد نے اس رائے سے اتفاق کیا تو ماں کو کیفیت جا کر
سنائی۔ انہوں نے کہا ”بیٹی اتنا کا ملنا تو ایسی بڑی بات نہیں بستی ہی موجود ہو کر ڈیرھ برس
کا بچہ گو دیں دودھ پنی رہا ہے۔ بغیر بھی نہیں دود پرے کی رشتہ دار ہے مگر شاہد کا
نام ایسا نکل گیا ہے کہ سب کانوں پر پڑا تھا دھرتے ہیں۔ بستی ہے تو غریب اور صیبت
ماری۔ گھڑی ایسی راند ہوئی ہے کہ صورت دیکھ کر جی کر ہٹتا ہے۔ خاصی کمائی مٹی ایک
میاں کے مرنے سے دودھ والوں کو محتاج ہو گئی۔ نوکر ہی تو وہ کیا کر گئی۔ کجحت کہی گھر

سے نکلی نہیں ہاں میرے کہنے سے دو چار دن کے لئے چلی جائے گی جب تک آٹا کا انتظام ہو۔ مگر ایسا غصہ کیا نہ ہو کہ بی شاہد کی اپنے پیسے میں کوئی ایسی دلی بات کہہ بیٹھیں نہ چاہی ڈرا بستی کو تو بلا لا۔

دونوں ماں بیٹیوں نے بستی کو بلکر رضا منہ کیا پہلے تو بستی انکار کرتی رہی جب اصرار سے بڑھ گیا تو کہنے لگی "خالہ جان اچھی بات ہے مگر میں نوکر سی تو کرتی نہیں اپنا بچہ سمجھ کر دو چار دن کو نہاں کے طور پر چلی جاتی ہوں۔" بستی کو رضا منہ کر اُسی وقت ڈولی منگوا پرچہ لکھ ماں نے شاہد کے پاس بھیج دیا۔ اور مسٹر شاہد کی حسن کے صاحبزادے ماشرخ حسن بستی کا دودھ پیٹنے لگے۔ اپنے مطلب کے دیوانے بھی سمیٹے ہوئے ہیں پھر شاہد کا تو ماشا اللہ سو سرنوں کی سرتی تھیں۔ اپنی عرض باؤلی اپنا مطلب اندھا جی کھول کر خاطر کی۔ زبان بھی ٹھچی۔ باتیں بھی اچھی۔ دوسرا انتظام چاروں کیا پندرہ دن بھی نہ ہوا تو بستی کو کہنا پڑا۔

"بیوی اب مجھے رخصت کیجئے۔ میں تو صرف چاروں کو کہہ کے آئی تھی۔" یہ ذرا بیڑھی بکھر تھی۔ رخصتیت اور فرعونیت اگر طہیت ہے تو ہر وقت ہو۔ یہ کہا اپنے وقت پر تو منو بلانی بن گئے۔ اور جب اپنی غرض نکل گئی تو ماش کے آئے کی طرح اکر رہے ہیں بستی بچاری سیدھی سداوی مصیبت زدہ سات پانچ اور دھوکا فریب جانے کیا اور سمجھے کیا۔ شاہد کے لئے اس کی سادگی سے فائدہ اٹھایا اور ایسا شیشے میں اتارا اور وہ لاگ دیا کہ ہاں کرنی پڑی اور کہہ دیا کہ:-

"اچھی بات ہے آپ آٹا کا انتظام نہ کیجئے میں دودھ پلا دوں گی۔"

باتوں میں تخیل اور خوشامدوں میں کمی تو دوسرے ہی روز سے شروع ہو گئی تھی مہینہ میں روز تو رنگا ہی اور تھا بستی دیکھ دیکھ کر تعجب اور حیران ہوئی جاتی تھی کہ پاتو

جناب جناب کہہ کر منہ خشک ہوتا تھا یا جناب سے تم، تم سے بستی اور بستی سے اتنا بن گئی۔ مگر زبان دسے پکی تھی۔ اور بستی تھی کہ یہ زبان وہ چیز ہے جس سے بیٹا بیٹی پر اسے ہو جاتے ہیں۔

اول اول تو آٹھویں دسویں جب جی گھرا یا اور جی چاہا گھنٹہ دو گھنٹہ کو گھرائی۔ مگر پھر تو شاہد نے وہ رعیب بٹھایا کہ ضرورت بھی ہوتی تھی تو اجازت لینے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔

وقت کی بات ہے کہ جاڑے ختم ہوئے اور گرمی شروع۔ ابھی رات کی سردی خاصی باقی تھی کہ بخار سچکے اور بخار کے ساتھ کھسر اس غضب کی کہ خاصے اچھے کھیلنے والے شے تین تین چار چار دن میں پٹ پٹ ہو گئے۔ غضب یہ تھا کہ بچہ ہی پر بس نہیں ساٹھ ساٹھ سینسٹھ برس کے بڑھے بڑھیاں اس میں چل بیسے۔ بستی کا لڑکا متر حیف دوبرس کا تھا اور طریقہ پھوٹی آنکھ کا دیدہ، سر شے کا سر۔ بستی کی زندگی کا سہارا اور دنیا کی تمام اُمیدیں جو کچھ تھیں وہ یہ بچہ۔ اسی کو پر رنڈا پا کا شہر ہی تھی اور اسی اُمید پر بستی تھی کہ بڑا ہو کر سب مصیبتوں کی تلافی اور رنجوں کا محاذ بندہ کر دے گا۔ بچہ کیک پاتا آکر ماکے گود میں پڑ گیا۔ مانتھا تو اس کا اسی وقت ٹھنکا تھا مگر ایک آدھ گھنٹہ بعد تو جسم کی یہ حالت کہ چپٹے بھونکے نو بیہوشی اور پریشانی کیسی۔ ناشا کی ماری کی جان نکل گئی۔ چاروں طرف بچہ کو گود میں سے سٹ پٹاتی پھری۔ کبھی اس سے کبھی اُس سے دیوانوں کی طرح ایک ایک سے پوچھتی، ایک ایک کو دکھاتی، ایک ایک سے صلاح لیتی۔ اس کے دل کی تو یہ حالت تھی۔ شاہد کو اپنی پڑوسی بستی کے پاس آئی اور کہا:-

"اتنا اس کو کھسرانکے گا اور یہ سب گھر میں پھیلے گا تم اس کو فوراً علیحدہ کر دو اور اپنی ماما کے پاس بھیجو۔"

بستی۔ "واہ بیوی واہ کیا کہہ رہی ہو! کس دل سے بھجدوں اس کو تو وہاں بھجدوں اور میں یہاں پڑی رہوں ایسا مجھے کیا لالچ واہ! شاہدہ۔ "ایسا ہونا چاہیے۔ اور ہوگا۔ تمہارے بچہ کی وجہ سے ہم اپنا گھر بیمار نہیں کر سکتے۔"

بستی۔ "بیوی میں کب کہتی ہوں کہ تم اپنا گھر بیمار کرو۔ تمہارا گھر تم کو مبارک ہو میں اپنے بچہ کو لیکر چلی جاتی ہوں۔ ذرا ڈولی منگوا لوں۔" شاہدہ۔ "تمہارا بچہ کا جینا نہایت ضروری جس کو چینیے کا کوئی حق نہیں۔ باپ اس کا نہیں۔ تم خود مفلس فقیر اور بیمار بچہ بھوکا رہے تو تمہاری بلا سے۔"

بستی۔ "تو پھر جو آپ کہتے وہ کروں۔"

شاہدہ۔ "تم یہاں سے ہرگز نہیں جاسکتیں۔"

بستی۔ "اور میرا بچہ؟"

شاہدہ۔ "اس کو جانا پڑے گا۔"

بستی۔ "واہ بیوی واہ کیا بات کہہ رہی ہو!"

شاہدہ۔ "سچ کہہ رہی ہوں۔"

ابھی یہ فقرہ ختم نہ ہوا تھا کہ مسٹر حسن اندرائے اور بیوی نے کہا:-

"ذیر حسن اتنا کہ بچہ کو بخار ہے اور چھپک معلوم ہوتی ہے اس کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ اس کو فوراً نانی ماں کے ہاں بھیج دیجئے کہ وہ اس کی نانی کو دیدیں۔"

بستی۔ "واہ بی واہ میں خود لے کر جاؤں گی۔"

شاہدہ۔ "تو ہرگز نہیں جاسکتی۔ ہمارا بچہ بھوکا روئے گا۔"

بستی۔ "روئے گا تو میں کیا کروں۔"

شاہدہ۔ "گستاخی مت کر۔"

اب شاہد آگے بڑھی۔ بچہ کو زبردستی گود سے چھین آدمی کو دیا کہ فوراً لے جائے۔ بستی بچہ کے ساتھ جاسکے واسطے چلی۔ مگر آدمی نے اس کو اندر کر دیا اور شاہد لے گیا۔ تو اگر گئی تو عمر بھر جلیانہ میں سرسے کی ہمارا بچہ کوئی وجہ نہیں کہ بھوکا رہے۔ چونکہ ایسے بیمار بچہ کو شاہد نے ہاتھ لگایا تھا۔ جس کو چپک کا اندیشہ تھا پورا غسل کیا اور باہر آکر جب دیکھا کہ امنا کی ماری چاروں طرف ٹکراتی پھرتی ہے تو نہایت غصہ سے کہا۔ اس فضول جھگڑے سے کچھ فائدہ نہیں۔ کیوں دوسروں پر نشان کیا۔ لے پہلے نہا اور پھر بچے کو دودھ پلا۔

اپنے سامنے نہلا دودھ پلوا بچہ ترس کو دیا اور خاص طور پر باہر کے آدمیوں کو تاکید کر دی کہ اتنا نہ ٹکلتے پائے۔ دو یا تین مرتبہ غریب نے جاتے کی کوشش کی مگر کام نہ رہی۔ مجبوراً سر کیڑ کر بیٹھ گئی۔

بستی کا بچہ شریف جب نانی کے پاس پہنچا تو شاہد اور شریف کی دونوں نانیاں ششدر رہ گئیں۔ سبب پوچھا تو نوکر کچھ بتانہ سکا۔ حیران تھیں کہ بیمار بچہ کو نوکر کا دے جانا اور بستی کا نہ آنا آخر معنی کیا رکھتا ہے۔ بچہ کا یہ حال تھا کہ بخار خوب زور کا تھا مگر دوسرے بچے کی بساط ہی کیا۔ آنکھ کھلتی تھی تو اماں اماں کہہ کر پکارتا تھا۔ موصوم کی اس حالت پر شاہد کی نانی کا دل مگڑ گیا۔ ڈولی منگوا سیدھی نوادی کے پاس پہنچیں۔

پہلا روز پہلا اتفاق بلکہ شادی کے بعد نانی نوادیوں کا پہلا آئینہ شاہد تھا۔ بستی تو ان کی صورت دیکھتے ہی دوڑ کر روتی ہوئی پیٹ گئی اور پوچھا۔

”خالہ جان میرا بچہ کیسا ہے؟“

”دیکھئے تو یہی میرے شریف کو نکال دیا کہ وہ بیمار ہے اور مجھے تہیں جانے دینے باہر پہرے بٹھا دئے کہ میں نہ ٹکلوں۔“

نانی - "بیٹی چل تو میرے ساتھ چل بیمار بچہ تڑپ رہا ہے۔ لوکر نہیں چاکر نہیں۔ اس ظلم پر کمر باندھی۔"

شاہدہ - "تو کیا آپ کی رائے یہ ہے کہ میرا بچہ بھوکا مر جائے۔"

نانی - "مرغی اللہ کی اگر مر جائے تو مگر اپنا بچہ کیوں چھوڑے۔ تم کو دس ہزار روغرض تھی اس کو رکھا ہوتا۔ اب یہ اکیلی کیوں رہے چل بستی کھڑی ہو۔"

غریب کے اوپر سب شیر ہوتے ہیں۔ نانی کے سامنے اس لئے نہیں کہ وہ نانی جنس بلکہ اس لئے کہ بگڑا ہوا انسان بھیرا ہوا شیر ہو جاتا ہے۔ شاہدہ اور احسن دونوں چپکے کھڑے دیکھتے رہے اور وہ بستی کو ساتھ لے ڈول میں بٹھا سیدھی ہوئیں۔ قدرت کے کارخانے بھی عجیب ہیں۔ بستی جس وقت چلی ہے تو اس کی آنکھ سے زار و قطار آنسو کی لڑیاں بہ رہی تھیں۔ رستے بھر دعائیں مانگ رہی تھی اور کہتی تھی۔

"الہی اپنے حبیب کا طفیل میرا بچہ تندرست ہو جائے"

بلبلاتی ہوئی اُتر سی بچہ کو گود میں لیا۔ کلیجہ سے چمٹا یا تو بخار ہلکا تھا۔ صبح تک بخار کا پتہ بھی رہا۔ اور بچہ خاصی اچھی طرح ٹہلنے لگا۔

ادھر یہ گذری، ادھر جو بندہ یا بندہ، انا کا انتظام ہو گیا اس کے دودھ کی آزمائش ڈاکٹر نے کی۔ چچک کا دودھ تھا احتیاطاً انا کو نہلایا دھلایا نئے کپڑے پہنائے۔ بچہ کو دودھ دیا مگر نہ معلوم دودھ میں کیا زہر تھا کہ حلق سے اُترنے ہی بچہ بخار میں لوٹھ ڈاکٹر آئے، لیڈی ڈاکٹر آئی۔ الغرض دودھ اور دو رات یہ نانا بتا بندھا رہا تیسرے دن دیکھا تو بچہ پر چچک کا جال پیا ہوا ہے۔ اب البتہ دیکھنا تھا کہ کون کون احتیاط کرتا ہو اور اس کے سامنے بھی بات قائم رہتی ہے یا نہیں، لیکن افسوس وہ تئوں شاں دوسروں ہی تک تھی اپنا بچہ پڑا تو حسن اور شاہدہ کے دونوں احتیاط وغیرہ سب بھول گئے چچک والے بچے کو دونوں کے دونوں پیٹ پیٹ کر روتے اور چمٹ چمٹ کر پیار کرتے گرمی کا موسم بخار اس

غضب کا کہ ہاتھ نہ دھرا جائے۔ ڈاکٹروں اور لیڈی ڈاکٹروں نے ہر چند نسخے بدے اور دوائیاں تبدیل کیں۔ مگر بخار نے جنبش نہ کی۔ شاہد اب بچہ کو خود اپنے ساتھ لیکر سوئی تھی اور سوئی کیا خاک تھی رات بھر وہ تھی سینکڑوں اور ہزاروں مرتبہ اس کو فتح بہ ہاتھ پھرتی تھی کہ پسینہ آ رہا ہوگا۔ مگر بدن تو نانا تھا کہ دیکھنے کے سوا کچھ تھا ہی نہیں مومن کی گرمی۔ بخار کی حرارت۔ چھک کا اترا تر معصوم دماغ کہاں تک صحیح رہتا۔ سر سام ہو گیا۔ یہ بھی عجیب وقت تھا۔ بچہ گردن دے دے پٹکتا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور آواز پہ شکل تمام نکل سکتی تھی۔ اس وقت ما کا یہ فعل بھی کچھ کم قابل بیان نہ تھا کہ بچہ کی کیفیت دیکھ کر اس نے نرس سے کہہ دیا کہ ”تم اپنے پاس رکھو مجھے دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے۔“ نرس کی ماتن نہیں رشتہ نہیں مانا نہیں۔ سر سام میں گرفتار معصوم اکیلا پڑا، سر دھننا اور کوئی آکر جھانکنا تک نہیں۔ نرس اکثر بیٹھی رہتی مگر بعض دفعہ ضرورتاً اور کبھی کبھی خواہ مخواہ اکیلا پڑا چھوڑ کر چلی جاتی۔ یہ حالت چار روز اور چار رات رہی مگر گھر کے کسی آدمی کو آکر جھانکنا تک قسم تھا۔ نرس تھی۔ یا بچہ۔ چوتھی رات بچہ کی حالت اول شام سے ہی خراب ہو گئی تھی۔ آج آدھی رات کے وقت بچہ نے آنکھ کھولی مگر افسوس وہ آخری موقع تھا ان ہی آنکھوں سے جو بیٹھ چکی تھیں چاروں طرف دیکھا اور ایک ننھی سی سبکی کے ساتھ ہمیشہ کو بند ہو گئیں۔

بچہ کے مرتے ہی شاہد و حسن کا پہلا کام یہ تھا کہ مردے سے دُور بھاگ گئے غسل و دفن لو کروں گے کیا۔ مگر ہاں شاہد اس صدمہ سے جو فطرتی تھا محفوظ نہ رہ سکی۔ اس نے کوشش میں کمی نہ کی۔ لیکن جس قدر بھلائی تھی اسی قدر بچہ کی صورت زیادہ یاد آتی تھی۔

ماں شاہد کے حالات سے بے خبر نہ تھی۔ ارادہ کرتی تھی کہ خود جائے اور سمجھائے مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ زیادہ تر اس وجہ سے بھی کہ وہ جانتی تھی۔ جاؤ گی۔

سمجھانے لگاؤں کی رنجیدہ۔ لیکن مانتا تھی اس حالت کو سن سن کر کلیجہ کٹتا تھا۔
آخر اُس نے یہ خط بیٹی کو لکھا:-

”بیٹی شاہدہ کو ماں کی طرف سے بہت بہت دعا۔

بچہ کی موت کا جو اثر تم پر ہوا وہ صحیح اور جو حالت تمہاری ہوئی وہ درست، تم اس صدمہ میں جو کہو وہ بکا اور جو کرو وہ جائز۔ مگر جو کچھ ہوا، ہو رہا ہے، قدرت کے ادنیٰ کرشمے اور دنیا کے معمولی کھیل ہیں۔ معاملہ خالق اور مخلوق، حاکم اور محکوم کا، اور مقابلہ زبردست اور کمزور، شیر اور بکری کا ہے۔ قطرے کا اگر ٹنا دریا کے ساتھ نہ ہو سکتا ہے۔ قدرت کا فیصلہ خالق کا انتظام، عالم کا نظام، بے معنی نہیں کچھ وقعت اور حقیقت رکھتا ہے۔ مجبور کے معاملہ میں اختیار کمزور کے سامنے طاقت، مفلس کے روبرو دولت، اگر داغِ بیخِ اوڑھے رائے صائب ہو تو اس زبردست ہستی کا پتہ دیں گے جس کی سلطنت اور حکومت ابدی اور ازل سے۔ یہ امتیازِ برتری اگر خیالِ دہشت اور قیاسِ محفول ہے تو پتہ دیں گے اور دکھادیں گے کہ عزت میں ذلت اور دولت میں نکبت پوشیدہ اور پنہاں ہیں مگر درستیِ مظلوم صورتیں اور مصوم انسان۔ اگر نظر وسیع اور آنکھ گہری ہو تو ہاتھ پکارے علی الاعلان اور بآواز بلند فنا کے نعرے اور انقلاب کے نعرے لگا اور گارہے ہیں۔ چین کا ہر پھول، پھول کی ہر گھڑی، ہمارے ہر دم۔ ہر دم کا ہر ذرہ، خوشی کی گھڑی، گھڑی کا ہر لمحہ، تزاں اور بربادی رنج اور مصیبت کا پیام ہے۔ کاشا رہی ہو جو بچکیں۔ او۔

لے رہی ہو جو دے دیا۔ غریبوں کی آہ، یتیموں کا نالہ، بیوہ کی فریاد
خالی جانے والی نہیں۔ ان مظلوم کی انتہا اور ان ذیادتیوں کی حد ہے۔
کیا تم کو وہ وقت یاد نہیں جب تمہارے ہاتھوں ایک بڑھیا ماما۔
ایک معصوم بچی رحیمہ اور منیرا دونوں بھوپچی بھتیجیاں حوالات میں
پہنچیں اور رات کے بارہ گھنٹے اس کواری لڑکی نے جو تمہارے گھر پر
تمہاری دبیز پڑھولی میں بیٹھ کر آئی اور برقع اوڑھ کر اتری، سہا پہل
کی گالیوں اور ظالموں کی جھڑکیوں میں گزار دے تمہارے دونوں
شکار خالوں کے پنجہ میں تھے رات ان کے سر پر تھی اور بیکوں کا
وارث کوئی نہ تھا! وہ تمہاری نگاہ میں تمہاری رائے میں مجبور بے بس جو
کچھ بھی ہوں مگر ان کے سر پر ایک وارث تھا، ایک مالک تھا، ایک حاکم
تھا، وہ جس کی عزت تم سے زیادہ، جس کی طاقت تم سے بڑی، اور
جس کی حکومت تم سے وسیع۔

میں اس خیال سے اس وقت بھی کاپنی اور اب بھی کانپ رہی
ہوں کہ بستی کا بچہ پھلر و سا لال، کلیجہ کا ٹکڑا، ماں کی گود سے چٹا
ہوا، تمہارے جفا کار ہاتھوں نامعقول چکلیوں اور خود غرض ترکیبوں
سے کیسی مصیبت میں پھنسا۔ ماچھ کی صورت کو ترستی رہ گئی اور بچہ
کی آواز کو پھر کتنا نکال دیا گیا۔ میں خوب جانتی ہوں کہ تمہارے دل پر
تمہاری طبیعت پر تمہارے دماغ پر اس کا رتی بھرا اثر نہ ہو مگر اس ظلم کا
انجام اس سختی کا نتیجہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہوا۔ خدا کا فیصلہ خاموش اور
اس کی لاشی بے آواز ہے۔ تم کو آج معلوم ہو گیا کہ مانتا کیا ہوتی ہے
اور بستی کے دل پر کیا گزری ہوگی اور اس کا کلیجہ کس طرح کٹا ہوگا

خدا نے دکھایا اور دنیا نے بتا دیا کہ جس کا کوئی نہیں اس کا بھی کوئی ہے اور جو بظاہر کچھ نہیں وہ حقیقت کچھ ہے۔

دنیا نے تمہاری عقل پر اور زندگی نے تمہاری آنکھ پر نوحوت اور نمکنت کے پرے ڈال دیے اور تم اس خدا سے جو عزت والا، قدرت والا، طاقت والا، قدرت والا ہے ایسی فرشتہ اتنی بیزار اور اس قدر متنفر ہو گئیں کہ کبھی بھول کر کہی یہ خیال نہیں آتا کہ یہ طاقت رب ہے والی اور یہ دولت کئے والی نہیں۔ حکومت عارضی اور دولت فانی ہے۔ جوانی مہمان اور طاقت چند روزہ صحت کے ساتھ علالت و تنہا کے ساتھ افلاس۔ خوشی کے ساتھ غم اور آزادی کے ساتھ قید و البنتہ ہیں۔ کبھی سوچو اور غور کرو کہ رحیمؑ پر کیا گذری۔ منیرؑ پر کیا بستی کیا بیٹنی اور شریف کیا کہتا ہو گا۔ میں کہتی ہوں اور محبت سے کہ یہ طیرہ غلط یہ راستہ ٹیڑھا اور یہ پھین اچھے نہیں۔ شاہنشاہِ ڈراس خدا سے جو حاکم حقیقی ہو اور لرزانِ روجوں سے جو کمزور لاچار ہیں۔ بچہ محصوم تھا بھگت گیا جو بھگتنی تھی۔ یہ جو کچھ ہوا کچھ نہ تھا۔ دنیا کی مصیبتیں، زندگی کی اذیتیں ابھی بہت ہیں سنبھلو اور گر سجدے میں اس کے آگے جو باوٹا ہو کا بادشاہ ہے اور گر گڑا اس کے حضور میں جو انکوں کا مالک ہے کٹر دل کو مارِ ظالم غصہ کو مسل، نوحوت کو غارت اور خود بینی کو دور کر پیل اس رستہ پر جو سیدھا اور اس دگر پر چھان ہے۔ وقت باقی ہو اور تھوڑے موجود۔ گر گڑا اندامت کے آفسوں سے۔ روضہ زندگی کی التجاؤں سے جا اپنے قدموں سے۔ گرا پنی آنکھوں سے۔ جھکنا اپنے سر سے جیسا کے آگے۔ منیرؑ کے روبرو اور بستی کے سامنے۔

شاہدہ! گو میں اٹھا کلیجہ سے لگا ہنیم شریف کو جو تیرے حکم سے بچھڑا اور خدا کے حکم سے ملا۔

نواں باب

زاہدہ کی طرف سے تو باپ اس قدر غافل اور اتنا الگ فکری تھا کہ کبھی بھول کر بھی اس کی نشاۃ الٰہی کا اُس کو خیال نہ آیا۔ ماں البتہ اس رنج میں گھلی جاتی تھی ایک آدھ دفعہ میاں کے منہ پر کہا بھی۔ مگر اس بھلے مانس نے اس کا نہ سنا اور اس کاں اڑا دیا اور اگر کبھی بہت ہی مہربان ہوا اور بڑی کی پریشانی کو قابلِ لحاظ اور سوال کو لائق جواب سمجھا تو اتنا کہہ دیا۔ ”مجھ سے صلاح یا مشورہ تو درکنار میرے سامنے ذکر کی بھی ضرورت نہیں۔ تم جانو تمہارا کام جو میری بیٹی تھی اُس کا میں نے کر دیا۔ اب یہ تمہاری بیٹی ہے۔ یہاں جی چاہے کرو اور جس طرح دل چاہے انجام دو۔ نکاح کے وقت شریک ضرور ہو جاؤں گا۔ جو لڑکے میرے علم میں ہیں یا جن کو پسند کرتا ہوں یہ بد نصیب ان کے قابل نہیں جو نا لائق ہیں وہ ایسے ہی شیوہ بنجے ہوں گے میں سچوں تو بیوقوف اور غور کروں تو دیوانہ۔“

بیٹی تو بہر حال بیابانی تھی میاں کی بے اعتنائی کا نتیجہ یہ تو ہو ہی نہ سکتا تھا کہ ماں زاہدہ کا کوٹھر بھر کر اربٹھائے رکھتی۔ چاروں طرف تدا توپ مچا لی۔ خدا خدا کر کے ایک بڑا لڑکا انٹرلس پاس اوسط درجہ کی آمدنی۔ بہت سے سادھے لوگ جاہل ٹھوٹ نہ بالکل صحت بہاؤر۔ میاں سے مذکرہ کیا مگر جب وہ تیرہری پر بل ڈال کر خاموش رہا اور جواب نہ دیا تو ہاں کر لی اور تالیخ ٹھہر گئی۔ نکاح سے پانچ روز پہلے زاہدہ یوں مٹھی۔ شاہدہ حقیقی بہن تھی اور اس کی شرکت نہایت ضروری مگر اس نے نہیں بلکہ دل لگی کرنے اور مضحکہ اڑانے باپنے بیٹی کو بلوا بھیجا۔ چنانچہ پہلے ہی روز کہ لڑکی کو مایوں بیٹے چند گھنٹے گزے ہوئے

دونوں باپ بیٹیوں نے اس طرح نکتہ چینی شروع کی۔

شما ہرہ۔ "کیوں اماں جان کیا بیڑیاؤں کے نکاح جائز نہیں ہے؟"

باپ۔ "بیٹی تم کو نہیں معلوم یہ تو اسلام کا خاص حکم ہے۔"

شما ہرہ۔ "اے ہے اماں جان تو میرا نکاح تو ہوا ہی نہیں۔"

باپ۔ "ہاں بات تو ٹھیک ہے اپنی اماں سے فتویٰ لو۔"

ماثر ماتھی ادھر تو بیٹی کی مفارقت کا اثر اس پر شوہر کے کچھ کے، اس پرستم

شاہد کا مضحکہ اپنی طرف سے ہر چند ٹالا بہت دیر تک خاموش رہی مگر حساب یہ

دیکھا کہ دونوں کے دونوں جان ہی کو آگے تو بیٹی سے تو نہ بولی۔ مگر شوہر سے کہا

"اس میں شک نہیں کہ خدائے تم کو اور تمہاری بچی کو فروت سے زیادہ عقل

اور حد سے بڑھ کر علم دیا مگر اس کے پستی نہیں کہ تمہارے سوا دنیا میں جتنے ہیں وہ

جابل اور بیوقوف۔ اگر اپنی قدیم روایات پر قائم رہنا اور بزرگوں کی تجاویز پر عمل کرنا

جہالت ہے تو مجھ کو اس بیوقوفی پر ناز ہے۔ میں بیوقوف اچھی اور جابل بہتر لیکن تمہاری

عقل اور علم اس بیوقوفی اور جہالت کے مقابلہ میں شما تمہارے واسطے مفید ہوتا ہو

دوسروں کی واسطے تو سراسر مضر اور نقصانی تکلیف دہ ہے۔ میں آج بیس برس کی بیا ہی ہوں

زیادہ برابر کی دولاکیاں آگے۔ نانی بن چکی۔ جوانی ختم اور بڑھاپا شروع ہے مگر جنگ

کسی بزرگ کے سامنے تم سے ہنس کر بات نہ کی۔ تمہاری عقلمندی کا نتیجہ اور تعلیم کا انجام

یہ ہے کہ تین برس کی بیا ہی لڑکی تم باپ کے سامنے اپنے نکاح کا ذکر نہیں ہنس کر اور

کھل کھل کر کر رہی ہو۔ خدا مجھ کو یہ وقت نہ دکھائے کہ اپنی باپ کے سامنے ایسی بے غیرت

بنوں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ تمہارے ہاں اکثر رسمیں جو دوسروں کی لگیں اور بہت

سی باتیں جو ادھر ادھر سے داخل ہوئیں قابلِ لعنت اور لائقِ ملامت ہیں لیکن وہ طریقے

اور وہ تدبیریں جو مرنے والے بزرگوں کے عقروں کے تجربے اور بیسویں برس کے غور و فکر

کے بعد چھوڑ گئے اُن پر منہ آنا اور بُرا بتانا کھلی ہونڈی غلطی ہے۔ بے غیرتی کا تو علاج نہیں منہ اپنا، زبان اپنی جس کو چاہو بُرا کہو جس کو چاہو بھلا۔ مگر بات کہو تو محتول اور کام کرو تو درست۔ یہ کیا جو منہ میں آیا وہ کہہ دیا۔ زور پر آئے تو پھول کو پتھر اور سونے کو مٹی بنا دیا مایوں کی رسم جس کا خاکہ اُٹا رہے ہو قدامت کا جو ہر ہے اگر سمجھتے اور غور کرنے تو نتیجہ یہ نہ ہوتا جو متاھل کا ہوا۔

مایوں کی خوبیاں مجھ سے سُناؤ اور خود ہی فیصلہ کرو کہ یہ جو کچھ میں نے کیا بجا کیا۔ یا بجا۔ قربان جاسیے ان پاک رُوحوں کے جو زندگی کے کیسے کیسے کٹھن رستے اُدھکیسی کیسی منہ میں اس خوبصورتی سے طے کرنی بتا گئیں۔

آجنگ یہ تو تم بھی دیکھ رہے ہو کہ اگر شادی کا ذکر بھی آجائے تو شریف بچیاں وہاں سے اٹھ کر دوڑ چلی جاتی ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ حیا ایمان کا جزو ہے۔ وہ لڑکی جو چار روز بعد شہر کے پہلو میں بیٹھنے والی ہے کس دل سے چار آدمیوں کے سامنے آنکھ ملا کر بات کرے۔ یا اپنے دل کی کیفیت دکھا کر اور اپنی حالت سُنا کر یہ بتا دے کہ میں تو اس دن کو ترس رہی تھی۔

اسلام کا فیصلہ یہ ہے کہ ایمان ہے تو جہان ہے اور شرم ہے تو ایمان ہو ہم مسلمان ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہماری لڑکیاں شرم و حیا کی دیویاں ہوں کہنے یہ ہماری رسم ضروری ٹھہری یا نہیں؟

ہمارے ہاں کا تمدن اس درجہ خراب اور ناقص ہو گیا ہے کہ شادی کے موقع پر چاروں طرف سے خواہ مخواہ کے فتنہ پرداز لوگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور جن باتوں کا سر نہ پاؤں دل سے جوڑ کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ کوئی بیٹی والوں کو بھڑکانا اور کوئی بیٹے والوں کا بہکانا اپنا فرض سمجھتا ہو۔ ایسی حالت میں کیا یہ ضروری نہیں کہ لڑکی ان فتنوں اور لچر باتوں سے متاثر نہ ہو اور یہ فتنہ پرداز باپ اس کے کان تک نہ پہنچیں۔

ایک کواری لڑکی جو پندرہ سولہ برس بیکے میں رہی اب اس گھر سے وداع ہوتی ہے اس کی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ بلکہ زندگی اب ہی شروع ہوتی ہے کیا وہ یہ حق نہیں رکھتی کہ اس کو مہلت دیدی جائے کہ وہ تخلیق میں بیٹھ کر اپنی آئینہ زندگی کے متعلق کچھ غور کرے اور سٹے کرے کہ اس کو آگے چل کر کیا کرنا اور کس طرح رہنا ہے؟ مایوں کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ لڑکی کا رنگ روغن خوب نکلتے اور اس کو اچھی خوراک دی جائے کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کو جو کچھ کھلایا پلایا جائے اس طرح سب کی آنکھ بچا کر؟

یہ میں نے نہایت مختصر طور پر تمہارے سامنے دو تین ہی باتیں بیان کی ہیں۔ مگر جب تم جیسا کہ عورت کے واسطے فنون سمجھتے ہو تو میں چھوٹی اور تم سچے۔
میاں بیوی کی بیوقوفی اور بیٹی مائی جہالت پر ہنستے اور ٹھٹھکے لگاتے رہے یا نکاح کے وقت تک اعتراضوں کا سلسلہ برابر جاری رہا مگر اس لئے مطلق پرواہ نہ کی اور اب زراہد بھی سسرال جا پہنچیں۔

دسواں باب

وداع کے دوسرے روز چالا تھا۔ شاہد اس رسم کو کس طرح جائز سمجھتی۔ اس سلسلے میں اس کے سامنے بابا سے کہا۔
”بابا اب تک تو جو کچھ ہوا وہ ہو گیا۔ اماں جان کی ذات سے متعلق کھنا اور اس کا اثر بالواسطہ یا بلاواسطہ ان ہی پر پڑ رہا تھا۔ لیکن اب ان کے خیالات ایک دوسری زندگی سے واسطہ رکھتے ہیں یہ وداع کوئی نئی وداع نہیں ہے۔ میں بھی آخر یہی گئی تھی یہ بھی کوئی انسانیت ہے کہ وہیں کو گئے چو میں گھنٹے بھی نہیں ہوئے اور طلبی کا تقاضا موجود! کچھ روز ان کو وہاں رہنے دیجئے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کی عادت

خصلت ٹوبہ سے واقف ہوں، اشد ضرورت ہے کہ آپ اس معاملہ میں دخل دیں اور دہن کو ابھی نہ بلائیں۔“

باب۔ ”بچی آخر سن تو تمہاری اماں بھی رہی ہیں۔ میں ہی اپنے منہ سے منع کر کے کیا لے لوں گا۔ میں نے تو شروع ہی سے اس کے معاملہ میں اسی واسطے دخل نہیں دیا جو ان کی سمجھ میں آیا وہ کیا۔ اب بھی دخل دینا نہیں چاہتا۔ جو ان کا جی چاہے کریں۔“

شہادہ۔ ”اما آپ اتنی سی موٹی بات بھی نہیں سمجھ سکتیں کہ شادی کے بعد مہل بیوی کو ساتھ رہنے کی کس قدر ضرورت ہو۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ ان کو تاج بلا لیں۔“

ما۔ ”خدا کا شکر ہے کہ میں مسلمان ہوں اور آباد ادا جدا دے وہ طریقہ جو موجودہ زمانہ کی کسوٹی پر بھی پورے اُتر رہے ہیں۔ میرے سر آنکھوں پر ہیں۔ مجھ کو میری بچی دیکھ رہی ہیں کہ میں اُس کے شوہر کو اور اس مندروں کو یہ یقین دلا دوں کہ اس کا کوئی مراجعت والی وارث نہیں۔ لڑکی گھر کا کٹرا تھی کہ نکال باہر کیا۔ وہ درحقیقت کلیجہ کا ٹکڑا ہی ہو سکی تھا دی قانون فطرت تھی۔ پورا گرویا۔ مگر ہتک مابا پ زندہ ہیں اس کے دکھ سکھ، رنج و راحت سے غافل اور بے خبر نہیں اور ان کا فرض ہو کہ شوہر کو یہ یقین دلا دیں کہ بیوی قیدی بن کر میرے قبضہ میں اور لونڈی بن کر میرے گھر میں نہیں آئی۔ یہ دہن جو اسوقت ہمارے گھر کی رونق ہو دوسری آنکھوں کی پتلی اور دوسرے دلوں کا سرد بھی ہے ہم کو یہ معلوم کرنے کی بھی ضرورت ہے کہ شوہر کے تعلقات سسرال والوں کے بڑا واس کے ساتھ کیسے رہے۔ وہ ناخبرہ کا رہے۔ یہ ہے اگر کسی معاملہ میں وہ صلاح کی محتاج ہو تو اپنے بچہ سے واقعات سن کر رائے دیں کہ جو کچھ پڑ گئی وہ کس طرح سلجھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہماری بچیاں اتنی بے غیرت اور ایسی بے شرم نہیں کہ کہہ لو یہاں متفق اور گھر سنبھالوں اپنا، دو گھنٹہ کی دہن اس گھر میں اور ان لوگوں میں جس کو اور جن کو پہلے دیکھا ہو نہیں۔ دسترخوان پر بیٹھ رکابی صفا چٹ کر دے اور حکم دے ”اور لاؤ“ دھڑلے

سے میاں کے سامنے ہڈیاں چھوڑے اور ساس نندوں کے روبرو منہ چیر چیر کر اور پھاڑ پھاڑ کر بوٹیاں چبائے۔ بیچاریاں کہنے سننے سے ایک آدھ لقمہ کھا سکتی ہیں۔ اس کو شرم کہو، حیا کہو، جدائی کا اثر۔ فراق کا نتیجہ، جو چاہے سمجھ لو، تم ایمان سے کہو کہ جب پالا پڑے اُن لوگوں سے جو ایک ایک ادا اور ایک ایک حرکت کو نگاہ میں رکھیں اور سابقہ دوران لوگوں سے جو کھانے پر پینے پر پینے پر اوڑھنے پر غرض ہر کام پر اور ہر بات پر رائے دیں اور خیال ظاہر کریں تو احتیاط ضروری ہے یا نہیں؟ ایمان نہ نکلے خدا کے واسطے یہ تو بتاؤ کہ مغرب جس کا کلمہ پڑھ رہے ہو کیا وہ ان کو ساس نندوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیتا ہے؟ وہاں صرف میاں بیوی ہوتے ہیں مگر یہاں دو لہا کے تمام عزیز، دوست بھی اور دشمن بھی۔

اس واسطے یہ چالوں کی رسم مقرر کی گئی جس کی بڑی مصلحت یہ بھی ہے کہ وہ ان کے ساتھ، دو لہا کے تعلقات بھی سسرال والوں سے بڑھنے شروع ہوں۔ میں نے ساری عمر میں تمہارے میاں کو دو یا تین مرتبہ دیکھا ہے۔ تم بتاؤ کہ اس کو کیا خبر کہ مجھ کو اس کی محبت ہے بھی یا نہیں۔ حالانکہ ضرورت ہے اور اس لئے بیٹی دیکر بیٹا بیٹے ہیں کہ ہم اس کو بھی بتا دیں کہ تیری محبت اپنی بچی سے کم نہیں۔ جس طرح نکاح نے ہماری بچی کو مادی اسی طرح ہم کو بیٹا۔ تم ان باتوں کو کیا جانو اور کیا سمجھو؟

گیارہواں باب

زاہر کا کی شادی کو سال بھر سے زیادہ ہو چکا تھا۔ دونوں بابا بچپوں کے فرض سے سبکدوش ہو کر اپنی اپنی جگہ خوش تھے۔ اختلاف مزاج کی وجہ سے نہیں اختلاف رائے کے سبب کبھی کبھار دونوں میں کچھ کھٹ پٹ سی ہوجاتی تھی درنہ اس

نیک بی بی کا ضبط و تحمل اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کرتا اور جو کچھ بھی کہتا صبر سے دیکھتی اور شکر سے سنتی۔ میاں نے یہ کوشش ہمیشہ کی بلکہ عمر بھر کی کہ بیوی اسکی مرضی پر رہے اور صلاح پر کام کرے۔ مگر خرابی یہ تھی کہ جن باتوں کو وہ عیب سمجھتا تھا یہ ہنر اور جو اس کی نگاہ میں برائیاں تھیں اس کے خیال میں بھلائیاں کبھی کبھی ایسا ہوا کہ دونوں کسی خاص معاملہ پر بحث کر رہے ہیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلتا۔ وہ اپنی کہتا یہ اپنی۔ قابل وہ ہوتا نہ یہ۔

جاڑوں کے موسم میں ایک روز دوپہر کے وقت آنا منہیاری بخل میں ٹوکری لئے آئی۔ گھر والی صورت دیکھتے ہی کہنے لگی۔

"آنا ہو سلام۔ کل سے دودھ بُلچکی ہوں دیکھو تو سہی سوئٹا سے ہاتھ

پرٹے ہیں۔"

آنا یہ۔ "بیوی کیا بتاؤں جب آنکھوں میں پانی اُترتا ہے صاف تو دکھائی دیتا نہیں۔ مگر دُسی کے سہارے چلتی ہوں۔ اب تمہاری صورت دھندلی دھندلی دکھائی دے رہی ہے۔ کیا آؤں۔ ٹھوکر ہے، دھککا ہے، بڑھاپے کے دن ٹیڑھا سودا۔ گر پڑوں تو چوٹ لگے سوا لگ نقصان ہو وہ جُرا۔ اس لئے نکلتا ہی چھوڑ دیا تمہاری صاحبزادی کا ذکر دودھ آیا۔ پرسوں وہاں گئی تھی۔ جا کر بھی پچھتائی۔ ان چوڑیوں سے تو ان کو نفرت ہی ہے۔ میرے منہ سے نکلا بیٹی تجھے شگے ہاتھوں دہم بھی نہیں آتا۔ ارے بیوی وہ صاف بگڑ گئی اور کہنے لگی۔ وہم کس چیز کا۔ کیا شوہر کی موت اور زندگی چوڑیوں پر موقوف ہے۔ عبد اللہ جیسی چوڑیاں پہنا گیا تھا ایسی ہوں تو ریشمیں دے جاؤ۔" خیر میں نے چوڑیاں پہنا دیں۔ ہاتھ ماشا اللہ پورا ہڈی وار پانچ ٹوٹیں جب دو چڑھیں دو آنہ کی چوڑی دس آنہ گرہ سے دیکر چار آنہ کی بچیں۔ انہوں نے پہلی ہی چوڑی پر کہہ دیا تھا۔ جو ٹوٹے وہ منہیاری کی۔ ادھر چوڑی چٹ ہوئی ادھر وہ

کھٹکھٹا کر ہنسیں۔ خیر میں جلتی رہی اور پہنائی۔ جب پہن پان چلے لگیں تو نوکر سی دیکھ
کہتی کیا ہیں یہ کالج کی چوڑیاں پہننے والیاں بیوقوف ابھی زندہ ہیں۔ اس پر تو میرے اگ
لگ گئی میں نے کہا بیٹی زبان سمجھال کے بولہ بیوقوف ہوگی تم۔ آپ جو اردوں کو بیوقوف
بناتی ہو تم سمجھتی ہو ہم عقلمند ہیں۔ پڑھے لکھے ہیں دو انگلیاں مانگنے پر رکھنی نصیب پائیں
نہیں۔ اگلے زمانہ کے لوگ اس کو فرض سمجھتے تھے کہ لڑکی سرگندھار اور چوڑیاں پہن کر
ضرور سلام کرے۔ اب یہ سلام قابل الزام ہیں۔ مگر مجھے ذرا یہ بتا دو کہ پانی کا گاس لیٹر
دینے والے سے یہ کیوں کہتی ہو شکریہ۔ پان کسی سے لیکر یہ کس لئے کہتی ہو تسلیم۔ بیٹی
یہ وہی فنکاری تھی۔ جو دینے والیوں نے اس طرح لڑکیوں کو بتایا تھا یہ ان ہی کے
چبائے ہوئے نوالے انٹاپٹ رہی ہو۔ تم مجھے ایک کہتیں نہ چار سنتیں۔
میں توبہ کہہ کر چلی آئی۔ مگر اب انشا اللہ نہ جاؤں گی۔ سلام کرتیں ٹھہرا ہی
پائیں میرا کیا لیا۔ اپنا کچھ کھویا۔

منہیاری شریف تھی یار ذلیل۔ مگر جو کچھ کہا اس انسانیت اور معقولیت
سے کہ باپ جو چپکا بیٹھا سُن رہا تھا۔ اس نے بھی شاہد کی یہ حرکت پسند نہ کی اور
آج عمر بھر میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ اس اللہ کے بندے نے بھی ایک معقول بات
سوچی۔ منہیاری چلی گئی تو بیوی سے کہا۔
”اُٹا ہو بات تو ٹھیک کہہ رہی تھی۔“

بیوی۔ ”تم ہی دیکھو خدا معلوم کس قسم کی بخت طبعیت لائی ہو کہ کسی سے جھکا
ہی نہیں آتا۔ اسی بیٹ کی بچی زاہدہ ہے۔ مگر دونوں کی طبیعت میں حالت میں
عادت میں خصلت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اُس کا بس چلے تو کسی غریب
فقر کو دنیا میں رہنے تک نہ دے۔“

اس کے اختیار میں ہو تو اپنی کھال کی جوتیاں تک حاجت مندوں کو پہنائے۔“

میاں۔ "میں سال سال بھر سے تو یہ سن رہا ہوں کہ شاہد خان نے اپنے اخراجات اس قدر بڑھا رکھے ہیں کہ آمدنی کافی نہیں ہوتی اور چاروں طرف سے قرض لینا پڑتا ہے اب یہ سنا ہے کہ ہزار روپیہ کا ایک جوڑا تیار ہوا ہے۔ اور کپڑا ہزار سے اس شرط پر دیا گیا ہے کہ اگر تین مہینہ میں روپیہ ادا نہ ہو تو ہزار کے ڈیڑھ ہزار سس سسٹن لے بیٹھے ہو کو اسی لئے الگ کر دیا ہے۔ بلکہ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ حسن بھی بیوی کے ان گٹوں سے پریشان ہو گیا ہے اور اکثر لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ پہلی نارنج کو کلب کا سالانہ جلسہ ہے اس کیلئے یہ تیاریاں ہو رہی ہیں۔ زاہد خان سے میں ناخوش ہی ہوں مگر حق یہ ہے کہ اس لحاظ سے تو میں اسے پسند کرتا ہوں کہ وہ آمدنی سے خرچ بڑھنے نہیں دیتی اب تو شاید ترقی پر مدلی ہوئی ہے۔"

بیوی۔ "ہاں خدا کا شکر ہے۔ پہاڑ پر تنوار پلے دیں گے۔ آج گئے ہوئے ساندیاں روز ہو اگر خط ہے نہ پتہ۔ وہ تو میری طرف سے ایسی غافل ہے نہیں۔ کہہ گئی تھی پہنچے ہی لکھوں گی۔ خبر نہیں کیا بات ہے۔ خدا پر رکھے۔ شاہد خان کا کیا کہا خدا ہی اس کی حالت درست کرے تو کرے۔ میں تو شرفِ اہی سے کہہ رہی ہوں کہ دیکھئے یہ اونٹ کس کل بیٹھتا ہے تم نے کبھی میری سٹنی ہی نہیں۔ وہ قرض پر حافط ہے۔ میرا یہ حال ہے کہ چراؤں اور قرض نہ لوں۔"

میاں۔ "میں کل گیا تھا تو حسن بھی موجود تھے۔ مگر چپکے چپکے اور رُس کے رُس کے جب وہ چلے گئے تو میں نے بالوں باتوں میں سنا دیا کہ خرچ آمدنی کے اندر رہنا چاہیے۔ مگر وہ کیا ایسی انتہی تھی فوراً سمجھ گئی اور کہنے لگی ضروری خرچ تو کوئی بھی رک نہیں سکتا سنا سے کہہ دینا آسان ہے۔ آدمی حساب کرے تو معلوم ہو کہ کونسا خرچ فالن ہے۔ کپڑا نہ پہننے؟ کھانا نہ کھانے۔ آدمی نہ رکھے؟ گاڑی نہ رکھے؟ چینی جان کے جو خرچ ہیں وہ تو دم ہی کیسا فتنہ ہو گئے۔ معیشت کی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ جیسا کہ

میں نہ ہوتا کہاں سے اُٹھے۔ میں تو ان زندہ گیوں پر تعجب اور تعجب نہیں افسوس کرتی ہوں بلکہ لعنت بھیجتی ہوں جو عمر بھر مصیبتیں جھیلیں اور پاپ پڑھیں کھائیں نہ پیئیں اور جوڑ جوڑ کر دوسروں کے واسطے چھوڑ جائیں۔ مجھ سے اگر کوئی یہ توقع رکھے تو یقیناً غلطی ہے۔ اسی وجہ سے مسٹر حسن ناخوش ہیں لیکن ان کی ناخوشی اتنی بے مصلحت اور اس قدر غلط ہے کہ میں اس کی مطلق پروا نہیں کر سکتی اور ایک میں کیا کوئی معقول بیوی بھی نہیں کر سکتی وہ ہوں یا آپ اگر کوئی یہ چاہے کہ ان جاہل بڑی بوڑھیوں کی طرح جو ٹھوک لگا لگا کر دوسرے جوڑتی تھیں میں بھی کھانا پینا اور ملنا جھلنا حرام کر دوں تو حاشا وکلاء میں اس زندگی اور اس دنیا سبکے باز آئی۔ انسان دنیا میں مصیبت بھگتنے کو پیدا نہیں ہوا۔ دنیا ہمارے واسطے جنت ہے اور یہ جس قدر سامان مسرت ہیں یہ ہمارے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ بد نصیب ہیں وہ کج مت جو اس قابل ہیں کہ ان اسباب کے فائدہ اٹھائیں مگر نہیں اٹھاتے۔ خدا ایسے ملعونوں کی صورت نہ دکھائے۔ ان سے سابقہ نہ ڈالے۔ میں مسٹر حسن سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ اگر اپنے فرض کئے ادا کرنے میں غفلت کریں گے تو نتیجہ کے ذمہ دار خود ہوں گے۔“

بیگم میں تو یہ گفتگو سُن کر سناٹے میں رہ گیا۔ ایکسا بات سسرری طور پر کہی تھی اس کے جواب میں قنچی کی طرح جو زبان چلنی شروع ہوئی ہو تو کسی طرح بند ہی نہ ہوئی۔“

بیوی غور سے میاں کی باتیں سُن رہی تھی اور بیچ بیچ میں ٹھنڈے سانس بھرتی جاتی تھی۔ بات ختم نہ ہوئی تھی کہ باہر سے مامانے لاکر خط دیا جس کو دیکھ کر میاں نے

”لوڑا اھلہ کا خط ہے“

بیوی۔ پڑھو خدا تمی جی رکھے۔“

میاں۔ ”تمہارے نام کا ہے۔ تم ہی پڑھو۔“

میاں نے خط کھولا اور اس طرح پڑھنا شروع کیا۔

اماں جان کی خدمت میں بہت بہت آداب ۔

آپ سے جہاں ہو کر یہاں پہنچی۔ کس طرح بتاؤں کہ رستہ کیوں کر کٹا اور دل پر کیا گذری۔ آدھری ہی تھی اور دل آپ کے پاس تھا۔ ابھی پہاڑ ہم سے کوسوں دور تھا کہ سرک پر ہرے ہرے تناور درخت جڑے اُکھڑے دکھائی دئے۔ خیال کیا کہ شاید آندھی آئی ہو۔ مگر ایک ہونٹ ہوں ساری سرک پر آدھری سے آدھری تک درخت ہی درخت تھے۔

جب ہم آبادی کے قریب پہنچے تو اور مصیبت نظر آئی نہ آدم نہ آدمی زاد۔ مکانوں کا ستھراؤ ہوا پڑا ہے۔ گاڑی والے نے کہا کہ صاحب کل شام کو یہ خبر سنی تھی کہ پہاڑ پر بھونچال آیا اور اس زور کا کہ تمام پہاڑ اٹ گیا۔ آگے بڑھے تو میسیدوں آدمی مکانوں کے نیچے دبے پڑے تھے۔ عورتیں

مرو بچے بڑھے سب ہی تھے، کڑیل جان، بڑھے پھونس، کچھ سسک رہے، کچھ ہلک رہے۔ کیسا قیامت خیز منظر تھا جہم کو دیکھنا پڑا۔ مصوم بچے ماؤں کے کلیجے سے چپے کے چپے رہ گئے۔ پہاڑ کے بڑے بڑے ٹکڑے۔ کسی کا پاؤں دکھائی دے رہا؟ کسی کی گردن، کہیں بچے کی ٹانگ ہے تو کہیں ماکا سر۔

ایک موقعہ تو ایسا دیکھا کہ بیان نہیں کر سکتی۔ ہزاروں لاکھوں من کا ایک ٹکڑا ایک عورت کی ٹانگ پر پڑا تھا۔ تڑپ رہی تھی۔ مگر دم نہ نکلتا تھا۔ ہم کو دیکھ کر ہاتھ جوڑنے لگی۔ کیا بتاؤں اس وقت دل کی حالت کیا تھی۔ اب تک وہ تصویر آنکھ کے سامنے ہے ہم چار آدمی تھے مگر چار کیا ہزار بھی ہونے تو اس کو سر کا نہ سکتے تھے۔ مجھ کو پاس بلایا اور

کہنے لگی "وہ سامنے مٹی میں میرا صندوق ہے۔ مگر دکھائی دے رہی ہے،
 اس میں دو ہزار روپے کا زیور ہے۔ یہ میری گچی کو دب دینا"۔ میں کیا
 جواب دیتی۔ کہنے لگی "پانی پلا دو"۔ ہمارے ساتھ صراحی تھی میں نے
 پانی پلایا۔ کوئی دو گھنٹے تک ہم وہاں کھڑے رہے اور ہماری آنکھوں کے
 سامنے اس کا دم نکل گیا۔ میں نے صندوق نکلوایا کھولا تو واقعی اس میں
 زیور موجود تھا۔ آگے بڑھے تو ایک محلہ میں البتہ کچھ آدمی زندہ موجود
 تھے۔ مگر یہ بھی مردوں سے بدتر تھے۔ کسی کی ہڈی ٹوٹی کسی کا کولہ اُترا
 کوئی زور ہاتھ تھا کوئی چنچ رہا تھا۔ آگے کے محلہ میں آدمی زیادہ بھی تھے
 اور زخمی بھی اتنے نہیں۔ مگر کچھ ایسا سہم چڑھا تھا کہ بات تک نہ کر سکتے تھے
 گنتی کے کچھ مکان اور دیکھے مگر وہ بھی اس حال میں کہ حالت دیکھ کر کچھ
 منہ کو آتا تھا مکان رہنے والوں کا اور رہنے والے مرنیوالوں کا کہ ہم
 بچا رہے تھے پہلے ارادہ کیا کہ اُسے لوٹ چلیں۔ مگر شام کے قریب کڑی
 فوج آگئی ذرا اطمینان ہوا اور ہم ایک مکان میں اتر گئے۔

عشما کی نماز پڑھ رہی تھی کہ ایک عورت دیوانہ وار اندر آئی اور چاروں
 طرف دیکھنے لگی اور کہنے لگی "بیوی اپنے بچوں کا صدقہ میرے دونوں بچے
 دیدو" میں متحیر تھی کہ کیا جواب دوں کہ وہ میرے قدموں میں گر پڑی او
 کہا "میرا جوان شیرا گلے برس مجھ سے بچھڑ چکا ہے اب مجھ راند دکھائی
 کے بہ دونوں بچوں سے ہیں۔ اور میری زندگی ان ہی دونوں سے ہے میری
 مانند ٹھنڈی کر دو۔ دل ان صورتوں کو تڑپ رہا ہے۔ اے بی بی میرے
 بچے ملا دے۔ بچوں والی میرے بچے دکھا دے۔ میرے کیچہ کے کٹ کرے
 میرے سینہ سے چٹا دے۔ میری آنکھوں کے تارے لا اپنی جوانی کا

صدقہ میری چار سال کی کمائی۔ میری ایک برس کی محنت میں ہاتھ جوڑتی ہوں، قدموں پر سر رکھتی ہوں۔ غریب ہوں بے وارثی ہوں۔ اس کی گفتگو سنکر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے اس کو بٹھایا کھانا دیا پانی دیا۔ ذرا غفل ٹھکانے ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس کے دونوں بچے بھی وہی کر زمین کے اندر پہنچ گئے ہیں۔

خیر یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اب آپ مجھے یہ بتائیے کہ اس زیور کا کیا کروں۔ مردہ کی وصیت کنیا کا مال، ایک ایک سے پوچھ چکی کہ کون بھی کیا تھی۔ مگر کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اس سہم کے آگے میں تو سب کچھ قبول گئی۔ اس کی بچی کو کہ ہر ڈھونڈوں اور کہاں سے لائوں کہ اس بار سبکدوش ہوں۔ یونہی تمام کام جہنم کے ستے ہیں، بیٹھے بٹھائے میرے اعمال کی اور ستر اہل آپ مولوی صاحب دریافت کیجئے کہ میں پورکس کو دوں؟ اگر کل کلاں کو اس کی بچی کا پتہ چل گیا تو کیا کرونگی؟ فقط اتنا تو معلوم ہوا ہے کہ مرنے والی کے میاں یہاں جانوروں کے ڈاکٹر تھے اور شاہجہاں پور کے رہنے والے اچھی میری اماں جان کسی کو شاہجہاں پور بھیج دیتے۔ شاید کچھ پتہ چلے۔ ثواب کا کام ہے۔ آنے جانے کا کرایہ وہاں کا خرچ سب میں دونوں کی۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ یہ تکلیف گوارا کرے تو عمر بھر احسان مانوں گی۔

اب یہاں اللہ کا شکر ہے کوئی کھٹکا نہیں سرکار کی طرف سے سب انتظام ہو گئے ہیں پھر بھی مصیبت ماروں کا کیا حال سناؤں برابر میں جوشی جی بیٹھتی ہیں ان کی بیوی ماوسہ بہن بہتین نیچے ہیں کل سات دم۔ مگر ساتوں کے ساتوں زخمی کسی میں اتنا سنگت نہیں کہ

ہل کر بھی باقی پی سکے۔ میں دونوں وقت جا کر ان کے ہاں کارسار کام کر دیتی ہوں۔ ان کے ہاں سے فارغ ہو کر اپنا کام کرتی ہوں اماں جان میرے کیا ہاتھ پاؤں گھس جاتے ہیں خبر نہیں اللہ کو کنسی ادا بند آجائے اور اسی بہانے مغفرت ہو جائے۔

میری دعار گنج العرش اور چھوٹی حامل وہیں رہ گئی ہے۔ یہ بھجوادی بچے۔ آبا جان کی خدمت میں بہت بہت آداب عرض کر دیجئے۔

آپ کی لونڈی

زاہلہ

خط باپ پڑھ رہا تھا اور ماں سن رہی۔ مگر جس طرح دونوں کی طبیعت میں آسمان زمین کا فرق تھا۔ اسی طرح حالت میں بھی۔ باپ نے ہنس ہنس کر پڑھا اور ماں نے رو رو کر سنا۔ وہ تو خط پڑھ بیوی کے آگے ڈال رہا تھا چھوڑا ہنستا چل دیا۔ مگر یہ اٹھی وضو کیا دو نفل شکرانے کے پڑھے کہ خیریت کا خط آیا ایک دفعہ پھر کھولا اور پڑھا اور سوچنے لگی کہ شاہجہاں پور کس کو بھجوں اور میرے کہنے سے کوئی جانے کیوں لگا۔ پر اے کارن! بلا وجہ، بلا سبب، کوئی تکلیف اٹھائے تو کیوں اور میں اذیت دوں تو کس لئے؟ چلو اماں جان سے کہوں شاید وہ کچھ انتظام کر دیں یہ فیصلہ کر خط ہاتھ میں لے ڈھولی منگو اسکے پہنچی اور وہاں کچھ تجویز کر کر بیٹی کو یہ خط لکھا۔

نور چشمی سلیمہ!

دعا۔ سخت تشویش اور بچہ انتظار کے بعد کل تمہارا خط پہنچا تمہارے باپا نے پڑھا اور میں نے مسخ کیا۔ رنج بھی ہوا اور خوشی بھی صدہ یہی

اور اطمینان بھی۔ ان ہزار ہا بندگانِ خدا کی کیفیت پڑھ کر بن پر خدا کا
یہ عذاب نازل ہوا بدن کے روئے کھٹکے ہوئے۔ مگر جس صداقت
کے ساتھ اس مصیبت میں تم مخلوقِ خدا کے کام آ رہی ہو اور اپنی باتیں
اپنا سکھ اور اپنی ضرورتیں دوسروں کے آرام ان کی آسائش اور ان کی
خواہشوں پر قربان کر رہی ہو یہ اسلام کا خاص منشا اور مسلمان کا عین
شیوہ ہے۔ خوش نصیب ہوں میں ماں جس کے پیٹ سے تم جیسی بچی پیدا
ہوئی اور تعریف کے قابل ہو وہ باپ جیسی نسل میں ایسی لڑکی ظہور میں آئی۔
اپنے ذاتی رنج و راحت سے ہر انسان بلکہ انسان کیا جانور تک متاثر ہوتا
ہے۔ مگر انسانیت جس چیز کا نام ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی تکلیف
زیادہ اور اپنی خوشی سے بڑھ کر دوسرے کی تکلیف اور دوسرے کی
خوشی کو سمجھے۔ مدد دے جو امکان میں ہو اور خدمت کرے جو ہو سکے۔
خدا کے نیک بندے اور خالق کی اچھی مخلوق وہی ہے جو بندوں کا غلام
اور مخلوق کا خدمتگزار ہو۔ تم نے اس غضب میں اور اس آفت میں بہت
کچھ کیا۔ لے لیا اور پیدا کر لیا۔ کہا ان مطلوبوں کی دعا اور ان بچاروں کی
انتخابی نہ جائیگی جو تمہارے ہاتھ کی دونوں وقت پکی پکائی کھا رہی ہیں۔
ان کی دعا وہ دعا ہے جس کے مقابلہ میں اور ان کی التجا وہ التجا ہے جس کے
سامنے امرار کی دولت اور بادشاہوں کی سلطنت بھی وقعت نہیں رکھتی۔
کئے جاؤ۔ جو کر سکتی ہو اور کرتی رہنا جو ہو سکے۔

نشا ہیما پنور میں نے آدمی بھیج دیا۔ خدا کرے سراسر لگ جائے۔ معاملہ ٹھیک
اور امانتہ پیچیدہ ہو مگر جس خدا کے بھروسے پر کام شروع کیا ہے وہی ختم
کر دے گا۔

بارہواں باب

تشاہد ہے۔" میں اگر ایک ایک کر کے جہالت کی پہودگیوں کو گنواؤں تو شاید تین چار دن میں بھی ختم نہ ہوں لیکن موٹی موٹی باتیں اگر بنا تم غور سے دیکھو تو صاف معلوم ہو جائے کہ یہ عقیدہ اور یہ خیال صریح غلطی اور گھٹی ہوئی بے وقوفی ہے۔ کیا مذہب سب سے آپ کو یہ ہی بتایا کہ مسافر سدھارا ہے جھٹڑوں نہ دو۔"

کیا اسلام اسی کا نام ہے کہ "شام کو دونوں وقت شے ہرے درخت کے نیچے کھڑی نہ ہو۔"

"سُرکھول کر نہ بیٹھو۔"

کیا مسلمانوں کا فرض ہے کہ "پردہ سی سکے سامنے جب وہ سفر سے آیا پاول ضرور رکھیں۔"

کیا یہ مسلمانوں کا عقیدہ ہو سکتا ہے کہ "پانی کھڑے ہو کر نہیں نوشا لیں دین کا رزق اُسے گا۔"

اور نہ لگیں ہا کر کھانے سے رزق کی برکت ختم ہو جائے گی۔"

افسوس افسوس کیا آپ اس میں بڑی خوبی دیکھتی ہیں کہ جس عورت کے بچے مر جائیں وہ نہا کر اٹھے تو لگے نہ ملے اس کا لُچ لگ جائیگا۔"

ماکیوں کر یقین آگیا کہ "روٹی سے پیاز کھانی منحوس۔"

"چار پانی کی پاننتی اونچی ہونی منحوس۔"

"عورت کے سفید کپڑے منحوس۔"

کس کس کو دھڑاؤں۔ مانا آپ کی دُشیا تو ان لٹویاں نہ سے پر ہے۔ آوی کیا ہوا خدا

ہو گیا کہ سب باتیں اسی کے اختیار میں ہو گئیں۔

”بچہ کو نہ لایا کا لاداد جلا د و نظر نہ لگ جائے۔“

مولود شریف ہے۔ اگر یو بان مسلک دو مردوں کی رو میں آئیں گی۔“

”لنگے سر جھاڑو نہ دو۔“

”انگلی چھوڑ کر کھانا نہ کھاؤ۔“

اما مسلمان ہونے کی حیثیت سے آپ کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تعلیم جاری
لے اب یہ لذت ہم سے دور کرنی شروع کی ہے۔ اور اس قسم کی جہالت اب آپ کو اپنی
بہنوں میں بہت کم نظر آئے گی۔ آپ فرما رہی ہیں کہ میں ”گیلے بال نہ سوؤں“ یعنی اسوقت
کہ نہا کر اٹھی ہوں ابھی لنگھی کروں۔ اور وہ بھی اُسے سیدھے بال نہیں یا نہ نہیں مگر کسی
طرح سمٹ جائیں۔ اما اگر بال کھو کر سونا منجوس ہو اور غالباً منجوس ہی ہوگا جو آپ منج
کر رہی ہیں تو ایک بات تو بتائیے۔ یہ فقیہ نیاں تو بڑی بھاگوان ہوتی ہوں گی جن کو برہنہ
بھی بال کھولنے کی مذمت نہیں آتی۔

پاپا کی یہ ہمیشہ کو ششش رہی ہیں نے بارہا چاہا کہ آپ ان پرانے ڈھکوسلوں سے
چھٹکارا کر ان خیالات پر آجائیں جن کی صداقت آئینہ کی طرح چمک رہی ہے۔ کیا ہم مسلمان
نہیں ہیں؟ کیا ہم معاملات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے ہم ان پرانی ٹیکہ بنجیوں سے
جنگی قوم محلہ یا اڑوس پڑوس کے دو ایک گھروں تک محدود تھی بہت زیادہ قوم کی خدمت
کر رہے ہیں۔ ہم جس طرح اس شہر کے مسلمان کو اپنا سمجھتے ہیں اسی طرح یہاں سو ہزاروں
لاکھوں کو اس کے رہنے بسنے والے مسلمان کو بھی بہن بھائی خیال کرتے ہیں۔ آپ خود ہی فیصلہ
کیجیے کہ ہماری کوشش قوم کی واسطے کس قدر مفید ہے۔ آپ دیکھ رہی ہیں ہمارے کلب میں
ہفتہ وار جلسے ہو رہے ہیں۔ قوم کی یکجہت و افلاس پر کس توجہ سے غور کیا جا رہا ہے۔
دونوں مدرسے جو قائم کئے گئے کس خوبی سے اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں۔ سوتے اوپر

لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں۔ یہ لڑکیاں جس وقت پڑھ لکھ کر نکلیں گی آپ ہی فرمائیے کیسی مائیں اور کیسی بیویاں ہوں گی۔“

مال۔ ”بیٹی مجھے تم سے بحث کی ضرورت نہیں۔ تم اپنی رائے پر قائم رہو میں اپنی پر۔ مجھے تمہارے معاملہ میں دخل دینے کی ضرورت نہ تم کو میرے۔ تمہاری کوششیں اگر قوم کے واسطے مفید ہیں تو خوشی کی بات ہے۔ میں اگر قوم کے واسطے مضر ہوں تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

بیٹی۔ ”یہ سب بڑی مصیبت ہے کہ جہالت آپ لوگوں کو ایمان کی بات نہیں کہنے دیتی۔ جو خیالات آپ کے وارغ میں سما گئے ہیں اور جو من مندی کی طرح آپ کی گودوں سے دوسروں کو لگ رہے ہیں۔ آپ ان کی خرابیوں کی بھی قائل نہیں۔ جنگ ان کی بیخ کنی نہ ہو ہماری کوششیں بار آور نہیں ہو سکتیں۔“

مال۔ ”اب یہ جہالت ختم ہو رہی ہے اور مجھ جیسی دس بیس بڑی بوڑھیاں باقی ہیں۔ اس کے بعد قوم پوری ترقی کر لے گی۔“

بیٹی۔ ”ایسا ہوتا تو پھر کیا کہنے تھے۔ بیشک اطمینان ہو جاتا مگر خرابی تو یہی آکر پڑ گئی کہ یہ زہریلے خیالات آپ کے بعد بھی دنیا میں موجود رہیں گے۔ ایک میں سمجھا رہی تھی کہ آپ کے پھندے ہیں نہ پھنسی۔ مگر دوسری بالکل آپ کا نمونہ ہے اس کے بچے ہو ہو رہے ہوں گے۔ اب فرمائیے آپ کے بعد جہالت کا خاتمہ کس طرح ہوا؟“

مال۔ ”مابوس نہ ہو اسی طرح رفتہ رفتہ کمی ہوتی جائیگی اور وہ وقت بھی آجائے گا۔ جب ہم جیسی جاہل عورتوں کا وجود ہماری اسلامی دنیا میں نہ ہوگا۔“

بیٹی۔ ”لیکن یہ کوششیں کیوں نہ ہو کہ آپ ہی اپنے خیالات تبدیل کر لیں اور سمجھ لیں کہ آپ کے خیالات نے مسلمانوں کو کس قدر نقصان پہنچایا۔“

مال۔ ”میں اس معاملہ میں تم سے گفتگو کرنی ہی نہیں چاہتی اور تم خواہ مخواہ سر

ہوئے جاتی ہو۔ مرنے والیاں سو بیوقوف اور تم ہزار عقلمندوں کی عقلمند ہی۔
بحث کی کیا ضرورت ہے۔

بیٹی۔ اسی کی تو اشد ضرورت ہے۔ کل کے جلسہ میں یہ رپز دیوشن پیش
ہوا اور باتفاق پاس ہو گیا کہ ہر ممبر جہانگ اس کے امکان میں ہو عورتوں کے عقائد
کو جو محض جاہلانہ ہیں اور جن کی بدولت قوم اس قدر تاراج و برباد ہو رہی ہو نازل کرنے کی
کوشش کرے ایسی حالت میں میرا فرض ہے کہ میں سب سے پہلے آپ ہی کی اصلاح کروں
ضرر ظاہر ہے آپ اس پر اصرار کیوں کرتی ہیں۔ کیا آپ اسلام کی دشمن ہیں۔ اگر آپ
ان کو اچھا سمجھتی ہیں تو مجھے بھی بتائیے۔

مال۔ اگر تم اس قابل ہوئیں اور اتنا ایمان تم میں موجود ہوتا تو روٹنا ہی کا
کا تھا۔ یاد رکھو کہ ان میں اور تم میں فرق یہ ہے کہ وہ خدا کو جتنی قدرت والا کہتی تھیں
اتنا ہی سمجھتی تھیں۔ ان کو ہر حال میں ہر رنگ میں ہر خوشی میں اور ہر رنج میں خدا دکھائی
دیتا تھا۔ سخت سے سخت مصیبت میں بھی ان کو یہ ڈر رہتا تھا کہ کہیں اس سے بڑی
مصیبت نازل نہ ہو جائے۔ حد سے زیادہ خوشی میں بھی یہ کھٹکا ان کے دل سے نہ
ہوتا تھا کہ زبردست قدرت والا اس خوشی کو رنج سے بدل دے۔ کہنے کو تو میں بھی اذیت
دونوں ہی خدا کو تادرو قدر سمجھتے ہیں۔ لیکن ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے قول سے عمل
بات سے چیت سے یہ ثابت کریں کہ جو سمجھتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں۔

امیر اہیم بودی جس وقت تختِ حکمت پر جلوہ گر تھا اگر یہ سمجھ لیتا کہ عین
کے ساتھ ذات لگی ہوئی ہو اور عت دینے والا ذات بھی دے سکتا ہو تو اسکی ماں جیلینہ
سے باہر اگر ہمایوں کے قدموں میں گرتی ہوئی تاراج کو ان الفاظ سے نہ لڑا دیتی کہ
”میں امیر اہیم کی ماں ہوں“

اسی یقین کا نام مذہب ہے جس کو مرنے والیاں ہر شے سے مقدم سمجھتی ہیں۔

اور ان کی گھٹی میں ڈالا جاتا تھا کہ وہ مذہب کی وقعت اور خدا کی عظمت کو کسی حال میں ہاتھ سے نہ دیں۔ اس واسطے ان کھیلے جو بچہ بڑی کی گئیں وہ مذہب کے دائرہ میں مذہب کے رنگ میں یا یوں سمجھو اس سانچے میں ڈھال کر سامنے رکھ دیں۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ ہم میں بہت سے نقص ہیں اور ان کی اصلاح یقیناً ضروری ہے۔ لیکن اس کچھ میں چند جوہر بھی ہیں جن کو تم ماننا سمجھ رہی ہو۔ اور حقیقت وہ کچھ سے لگائے کے قابل ہیں۔ یہ اصول جن پر تم مسترخ ہو با دن تو لے اور پاؤ رتی کے ہیں۔ تمہاری نگاہ میں اگر مذہب کی کوئی وقعت، تمہارے دل میں خدا کا کچھ خوف، تمہارے دماغ میں اگر رتی بھر عقل اور تم میں اگر بڑے نام انسانیت، اور خصوصاً سی بھی نسبت ہوتی تو تم سمجھتیں کہ ان کی اصلیت کیا اور حقیقت کیسی ہے۔

”مسافر گیا ہے جھاڑو نہ دو“ اس سے مذہب کا کیا واسطہ؟ مگر اس میں جہالت کی کیا بات ہے؟ جانے وقت چیز بہت، اسباب کچھونا ہیں چیزیں باہر ہوتی ہیں۔ اگر یہ خیال نہ جادو یا جانا اور جاتے ہی جھاڑو مل جاتی تو چھوٹی موٹی چیزیں جھاڑو میں کوڑے تک فدا پہنچ جاتیں۔ شاید کوئی اگلوٹھی چھلا پتہ۔ بلی کا غدر پتر بھی غارت ہو جاتا۔ بتاؤ یہ احتیاط کیا بُری ہے؟

چلو آگے بڑھو شام کے وقت ہرے درخت کے نیچے سر کھول کر نہ کھڑی ہو بیٹھی یہ تو موٹی سی بات ہے لڑکی بایاں شام کے وقت سر گوندھتی ہیں اور جب دونوں وقت ملتے ہیں اسی وقت پر زبدا سیرالیتے ہیں مگر درخت پر چالور ہوئے جو زیادہ ہرے ہرے درخت پر بیٹھتے ہیں اور بیٹ کر دی تو گندھا گندھا یا سر برباد ہوا یا نہ ہوا؟ خدا کے واسطے بتاؤ تو سہی اس میں جہالت کیا ہوئی؟

”مسافر کے واسطے چاول“ کی جو کہتی ہو دل میں غور کرو اور خود ہی قائل ہو جانا۔ آدھی رات کو مسافر اُترا اور پیٹے سے خبر بھی نہ تھی کہ کھانے کا انتظام ہو جانا۔ فرض کر لو

مہمان امیر ہے میزبان غریب جس کے پاس پیسہ ہے نہ وقت پر انتظام کر سکتا ہے۔
رات آدھی ہے کچھ انتظام ہو بھی نہیں سکتا۔ میزبان کی غربت کو کس خوبصورتی سے
ڈھکا نکاسے کہ صرف چاول پکا کر سامنے رکھ دے۔ یہاں سے کہنا ایک معمولی سی
بات نے کتنی خرابیوں کو دور کر دیا۔

پانی کھڑے ہو کر پینے کے نقصانات تو ظاہر ہیں۔ خود طب کی رو سے ثابت
ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینا مضر ہے۔

اسی طرح پاؤں ہلا کر کھانے کی کیفیت ہے ضرورت ہے کہ آدمی اطمینان سے
کھائے اور پیے۔ تاکہ کھانا انگ لگے۔ اور جو مقصد اصلی ہے وہ پورا ہونے کہ اور اٹھا
کھانا زہر اور پانی تیرن کر اترے۔

کاش تم کو خدا عقل دیتا اور سمجھتیں کہ عورت نہا کر اٹھنے تو اس لئے کہ اس کے
بچے مسکے یا مر گیا گئے نہ ملو۔ کتنی مسئول تجویز ہے۔ بچوں کی شرط تو برائے نام ہے بہت کم
ایسی اللہ کی بندیاں ہوں گی جن کا کوئی بچہ نہ مرا ہو۔ احتیاط دونوں کے واسطے ہے
اور اس لئے ہر عورت ایسی حالت میں گئے ملتی ہوئی ہچکچائے گی۔ اب تم اس کی وجہ
سنو۔ عورت کے بال نہانے کے بعد خشک نہیں ہوتے اور ان میں پھوڑنے کے بعد
بھی پانی کے قطرے موجود رہتے ہیں اگر اس سے کوئی بلیگا یا کسی کو ملنا پڑیگا تو بیشک
کہڑوں کے خراب ہو نیکا احتمال ہو۔ تم ہی دیکھو کس قابلیت سے اس ضرورت کو پورا کیا
اس بُرائی کا انسداد کیا کہ دونوں میں ایک کو ناگوار نہ ہو۔

”روٹی پر سپرد کھلی“ تم ہی سمجھ لو بُری ہے یا نہیں۔ پیاز کس قدر بو کی چیز ہے
اس بہانہ سے اس کو پاس ہی نہ آنے دیا۔

”چار پانی کی پائنتی“ خود ہی کھڑی کر کے دیکھ لو کیسی معلوم ہوتی ہے اگر اس کو
منہ سے کہہ کر روک دیا تو کیا گناہ کیا۔

ہاں عورت کے سفید کپڑوں کی بحث ذرا ٹیڑھی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آجکل کی تعلیم یافتہ لڑکیاں غیروں کے دیچھا دیچی سفید کپڑوں کے شوق میں مبتلا ہیں مگر جنہوں نے سہاگ کے واسطے رنگین لباس مخصوص کیا تھا ان کو بیوہ اور سہاگن میں امتیاز کی ضرورت تھی۔ تاکہ خدا کے حکم بیوہ کے نکاح کی تکمیل باسانی ہو سکے اور بیوہ عورت، دیکھ سکے کہ اس کا رنڈا یا باسانی تمیز ہو سکتا ہے۔

ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ خود اسلام عورت سے متوقع ہے کہ مردوں کی طرح ہاتھ کے ناخن سفید نہ رکھے، میں تسلیم کرتی ہوں کہ بعض مرد بھی اب سفید لباس پسند کرتے ہیں مگر کثرت ابھی ان ہی لوگوں کی ہے جو عورت کے رنگین لباس کو سفید پر ترجیح دیتے ہیں یہ سیر بھی دیکھ لو کہ جن کی نقل میں سفید لباس پسند کیا جاتا ہے وہ خود رنگوں کے دلدلہ ہیں۔ ”بچہ کے کالے دانہ کی رسم تمہاری سمجھ میں نہ آ سکی۔ اس سے نظر گذر سے واسطہ نہ سہی مگر اس کا مقصد صرف ہوا کا صاف کرنا ہے کہ بچہ کی ارد گرد ہوا آدمیوں کی کثرت سے خراب نہ ہو یہ ہی کیفیت مولود شریف یا اور مجلسوں کی ہے کہ وہاں آدمی زیادہ ہوتے ہیں ہوا خراب نہ ہونے پائے۔

”ننگے سر جھاڑو دینا کھلی ہوئی نادانی ہے کہ خاک سر میں جائیگی اور اگر سر گندھا ہو اسے تو اور بھی بال برباد ہوں گے۔“

انگلی چھو کر کھانا تم کو شایر اچھا معلوم ہوتا ہو۔ میری آنکھوں کو تو زہر معلوم ہوتا ہے اور میں اس کو بہت بڑی ہٹنیری خیال کرتی ہوں۔

بیٹی ان باتوں پر تم لاکھ جہالت کے آواز سے کس لوگران کی تہ میں ٹھک کھلتے ہوئے پھول دکھائی دیں گے۔ تم مدرسوں کی جو کہنتی ہو تو بیوی جس قدر فیض تمہارے ان مدرسوں سے جاری ہوتا ہے۔ یہ مرنیوالی بیویوں کے ہر گھر سے جاری تھا مشکل سو کوئی معقول گھر ایسا ہوتا ہوگا جہاں ایک آدھ محلہ کی غریب لڑکی پڑھنا لکھنا نہ سیکھتی ہو۔ ہاں تم

یہ اعتراض کر سکتی ہو کہ وہ تعلیم صرف کلام اللہ رکھ لینے کی ہوتی ہے۔ مگر میری بیٹی میں تو
 سب کچھ کی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو بھی اس سے زیادہ نہیں دیکھتی کہ خط لکھ لیں اور پڑھ لیں تم نے میری تعلیم
 پائی ہے اور میں اس نعمت سے محروم ہوں تمہارا بوجی چاہے خانہ داری کے حساب کتاب کے
 متعلق مجھ سے دریافت کر لو۔ پیسوں کا، روپوں کا، اثرو فیوں کا، آٹے کا، گھی کا گوشت
 ترکاری کا تم بھی شاید اتنا ہی حساب زبانی بتا سکو گی جتنا میں، لیکن میں اگر تم سے یہ کہو گی
 کہ ذرا آیت الکرسی تو پڑھ کر سنا دو۔ تو بھلیں جھانکنے لگو گی۔ تمہارا گھر جس طرح رہتا ہے
 اور جہنم سلیقہ تمہارے گھر سے ٹپک رہا ہے۔ وہ مجھے بھی معلوم ہے۔ جاہل کے گھر سے
 اپنے تعلیم یافتہ گھر کا مقابلہ کر لو۔ اور فرق کا فیصلہ تم خود ہی کر لو۔ تمہارے ہاں ماہا اگر کسی روز
 نہ آئے تو اللہ چاہے گھر میں کھیاں بھنگتی رہیں۔ میرے ہاں خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہر دم سے
 ایک آدمہ مالا زیادہ ہی ہے۔ مگر میں جیتکا اپنے ہاتھ سے جھاڑو نہ دوں مجھ کو چین نہیں
 پڑتا۔ نہ کوئی شاید دہنیوں بھی باورچی خانے کے جھانکنے کا اتفاق نہ ہوتا ہو گا۔ میں دونوں وقت
 تمہارے آیا کا سالن خود اپنے ہاتھ سے بچھاتی رہتی ہوں۔ اور اس کو اپنا فرض سمجھتی ہوں تمہارا
 جس معاملہ میں جی چاہے مجھ سے بحث کر لو۔ یہ تمہارے آبا بھی بیٹھے ہیں ان ہی پر فیصلہ رہا۔
 میری آمدنی تمہاری آمدنی سے زیادہ نہیں اور میرا جائز خرچ تمہارے جائز خرچ سے دو گنا۔
 مگر خدا کا شکر ہے ایک دہیسہ کی قرضدار نہیں۔ بلکہ فقیرانہ رہتا اللہ کا دیا وقت بے وقت
 کے واسطے میرے پاس نکل ہی آئیگا۔ بوسے جناب آپ بھی کچھ فرمایے غلط کہتی ہوں یا صحیح؟

تیرہواں باب

وقت کی پوری رو، حکومت کا زبردست اثر، مغربیت، ہر ذمی روح اور غیر ذمی
 روح شخص اور شے سے ظاہر ہونے لگتی۔ حد یہ کہ زمین کی پیداوار اوسے ہوا کا کرہ بھی
 اسی رنگ میں شرابور تھا۔ اس نہر باہل کا اثر اتنی ترقی کر گیا تھا کہ زمین سے پھول اگتا تھا تو

خوشبو سے محروم اور ہوا میں طائر چمکتا تھا تو نصیب سے پاک برقی اثر کی طرح یہ زلزلہ لمحہ
 لمحہ ترقی کر رہی تھی۔ زاہد کا شہر احسان تھا تو یہ سیدھا اور حد سے زیادہ سادہ
 وقت کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ آخر انسان تھا، دل بھی تھا آنکھیں بھی، دماغ بھی اور جوانی
 بھی۔ عمر گذری اس طرح کہ پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنی اور پس اس کے سوا
 گھر سے نکلنا قسم اور سیر کر جانا گناہ۔ اس جو پہاڑ پر بیٹھا اور یہ چھل چھل کے چلیسے دیکھے کہ
 ہر طرف کے ٹکڑے عورتیں شہروں کے ہاتھ میں ہاتھ دے۔ کوئی برقع میں، کوئی ساڑھی میں
 کوئی گاڑی میں اور کوئی یوں ہی، سبزہ پڑھتی پھر رہی ہیں۔ آنکھیں کھل گئیں۔ بنایا یا تھا
 اول تو آدمی تھے ہی نہیں اور جب وہ بھی گئے تو چھانٹ چھانٹ کر اور ڈھونڈ ڈھونڈ
 کر ملا۔ ان لوگوں سے جو ترقی چلا اور دنیا بڑی سی خیال کے تھے۔ مگر ایک چھ ہی مہینہ بھاڑ
 کی ٹھنڈی ہوا لگی اور منظر دیکھے۔ ایک تو انسان اور پھر نوجوان، طرز یہ کہ کان میں آئے
 ترقی کے غر سے وجہ کیا اور سبب کیا کہ دنیا ترقی کرتی اور احسان نہ کرتا اس احساس کا پہلا
 نتیجہ اور اس کو کشش کا پہلا انجام یہ تھا کہ جو جیسی اب تک نعمت اور امرت تھی وہ فرشتہ اور
 حضرات کا شکار ہونے لگی۔ یہ تو نہ کر سکا اور کر سکتا بھی نہ تھا کہ ایک دم سے رسی توڑ انگ کھڑا
 ہو جائے اس اتنا ہونے لگا عشا کے بعد مگر بھی گھر سے باہر نہ نکلنے والا آدمی ہفتہ میں دو مرتبہ
 کبھی تین مرتبہ تماشہ میں پہنچنے لگا۔ نماز گذرے دار ہوئی۔ وظیفہ ختم ہوا۔ وہ تھا اور
 سٹوری پارک۔ مدرسہ کی حاضری مجبوری ہوئی۔ ٹکڑا اسی کی بدولت مل رہا تھا اور اس کا
 پس چلنا تو اس قطعہ زمین کو جو نوہ جنت تھا جو میں گھنٹوں میں ایک لمحہ کیلئے نہ چھوڑتا۔
 چاندنی رات ہیں جس وقت ترقی پارک کے ہر ذرہ زمین سے برآمد ہوتی تو آنکھیں روشن
 ہو جاتیں۔ زاہد کا لاکھ بھولی اور ہزار سیدھی تھی۔ مگر میاں کا رنگ نور اتار لیا۔ لیکن کیا
 کر سکتی تھی پردیس کا معاملہ اپنی لوگ، کہتی کس سے اور پوچھتی کیا ترقی کا پہلا دیو بدطنی
 اور غوث بدکار احسان نے سب سے پہلے طعن مومن کی زنجیر توڑ کر غیر کو شرسے بدلا اور حکم دیدیا کہ

بیوی گھر سے باہر نہ نکلے۔ ذرا اھلچ میاں کے سامنے اور اس کے حکم کے مقابلہ میں کسی شے کو قسیح نہ سمجھتی تھی۔ چمک مڑا کھڑا پر رکھا مگر ہمسائی جس کا کھانا دونوں وقت جا کر کھاتی تھی۔ اس حکم سے سخت مصیبت میں پھنس گئی اور تین چار دنوں پر کڑکے کے فاسے گزرنے لگے۔ پرنسپل کے دو نوکر رہ گئے تھے اسی حالت میں لڑکائی لڑکائی گھسٹتی گھسٹتی دوپہر کو چلی چلی دیوار بیچ گھر میں تیسرے پہر پہنچی۔ احسان آڑی ہانگ نکالے، کھدے سے ٹپن لگا رہا تھا کہ یہ آواز کان میں آئی۔ بیٹی اپنے ہاتھ پاؤں کا صدقہ میرے ہاں آکر نہیں اپنے ہی اڑنڈال دیا کہ ہم روٹی کو زس گئے۔ بچے بولیں بولیں کوستے پھر رہے ہیں۔ میرے پاس سو اودھائے کیا دھوا کیا ہے۔ خدا خوش رکھے گا۔ الہی بچی دو دنوں نہاسے پوتوں پھلے۔ اس پر یوں میں تیرا عنایت نے ہم مردوں میں جان ڈال دی اور ہم مرقوں کو چلا دیا۔ اچھا خدا اور نیچے تو میرے پانچ بچے، میرا لنگڑا شوہر، میری دیکھی ہوئی اتنا۔ تجھ کو دعائیں دے رہے ہیں۔ اسے یکم بھوک کی تکلیف سے چھٹکارا دلو اور پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کر۔

احسان۔ "بس دوسرے کی بھی سُندان کو اتنی فرصت کہاں۔"

عورت۔ "اچھا میاں خوش رہو۔"

احسان۔ "خوش رہنا اور ناخوش رہنا کیا صرف تمہارے ہی کہنے پر ہے؟ عورت اتنا سُنتے ہی پھر نہ بولی اور جن قدموں سے آئی تھی ان ہی قدموں سے اُٹھ لوٹی۔ احسان کپڑے پہن، سگریٹ سلگا، چھڑی ہاتھ میں لے، سیٹی بجانے، باہر گئے۔ مگر اھلچ کے کلیجہ پر جو چوٹ عورت کے بیان سے لگی تھی وہ اتنی گہری تھی کہ اسکی آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔ اس نے ہمسائی کو آواز دی اور کہا "آٹا بھجھو، غور نماز پڑھی اور دعا مانگی کہ الہی اگر میری لگی ہوئی حالت کچھ اور احسان کو اپنے حلف و انان میں رکھو۔" میاں احسان کی نرقی کی کوشش زبانی چس خرچ نہ تھا۔ کسی دفعہ تصدیک کہ علی صورت بھی اختیار کروں۔ مگر تہمت نہ پڑی آخر ایک دن جی کر کر کے کہہ ہی دیا۔ جلد آج

تم کو بھی تماشہ دکھا لاؤں کیا یاد کرو گی۔“

احسان کی خواہش جائز تھی یا ناجائز یہ علیحدہ بحث ہے مگر سوال یہ ہے کہ بیوی بھی اس کی اہل تھی یا نہیں۔ بہر حال زاہد کا جیسی بیوی کو جس کی تعلیم یہ تھی کہ شوہر مجازی خدا ہے۔ تعمیل میں کیا عذر ہو سکتا تھا احسان نے کیا اور وہ چلی گئی۔ صبح کو جب احسان سو کر اٹھا تو بیوی سے پوچھا:-

”کہہ دو تماشے کی بابت کیا رائے ہے کیسا رہا؟“

زاہدہ:- ”رائے کیا دوں“ اچھا تھا۔“

احسان:- ”اچھا سے کام نہیں چلتا۔ تم اس کے فائدوں پر نظر ڈالو انسانیت زندگی میں جو خرابیاں اور نقائص ہیں۔ ان کا انہ راکس خوبصورتی سے کیا گیا تھا وہ واہ بُرائی کی تصویر آنکھ کے سامنے پھر جاتی ہے۔ تم نے دیکھا شراب کا نتیجہ کس قابلیت سے دکھایا کہ پھر شینے کو جی نہیں چاہتا۔“

زاہدہ:- ”مگر جہاں بہت سی بُرائیوں سے دل ہٹ سکتا ہے وہاں بعض خرابیوں کی طرف طبیعت کے راغب ہونے کا بھی اندیشہ ہے۔ حُسن و عشق کی داستان جو تمام تماشہ کی جان تھی بالکل وہی سنی رکھتی ہے جو آجکل کے نادلی جس طرح اس قسم کی لٹو کتابوں کا عورتوں کے ہاتھ میں دینا ضرر ہے اسی طرح تماشہ بھی مفید نہیں۔“

احسان:- ”تو کیا تم دوبارہ چلنا نہیں پسند کرتیں؟“

زاہدہ:- ”اگر تم کہو گے تو سراسر آنکھوں سے تعمیل کروں گی۔“

اس واقعہ کو ہمینہ بھر سے زیادہ ہو گیا۔ ایکساہذا احسان بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ رات کے شاید آٹھ بجے ہوں گے کہ ہسائی کی لڑکی نے آکر کہا:-

”ااں یک پان کا کٹڑا مانگ رہی ہیں۔“ آج سیاں احسان کو اپنا پُرانا حکم یاد

آگیا اور بیوی سے پوچھا ”ابھی تک تم ہمارے نعو سلسلہ برابر جاری ہے؟“

زاہدہ - "کس قسم کا سلسلہ؟"

احسان - "وہی روٹی پکانے کا۔"

زاہدہ - "تمہارے منع کرنے کے بعد کیوں کر ممکن تھا۔ میں نے اسی روز سے

وہاں جانا بند کر دیا۔ اب وہ اپنا آٹا بھیج رہی ہیں۔ میں یہیں پکا دیتی ہوں۔"

احسان - "مگر میں تو منع کر چکا تھا؟"

زاہدہ - "تم نے جس بات کو منع کیا تھا اس کی تعمیل ہو گئی۔ گو حکم تم نے

کچھ نہیں دیا مگر تمہارے اس فقرے سے کہ ان کو اتنی فرصت کہاں میں یہ سمجھ گئی تھی

کہ تمہاری مرضی نہیں۔ اس لئے میں نے جانا آنا بند کر دیا۔ اگر مجھے یہ معلوم ہو جانا کہ تمہارا

یہ منشا ہے تو میں یہ بھی ختم کر دیتی۔"

احسان - "تمہارے بیان سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ تم اتنا تو سمجھ گئی

تھیں کہ مجھے یہ سلسلہ پسند نہیں۔ تم کون کی خدمت میں کیا مصلحت دکھائی دی۔"

زاہدہ - "آئندہ یہ بھی نہ کروں گی۔"

احسان - "اب تک جو کیا؟"

زاہدہ - "غلطی ہوئی۔"

چودھواں باب

مسٹر حسن کی ذاتی آمدنی تو کچھ بھی نہیں، جو کچھ اٹلتے بٹلتے وہ باپ کی کمائی

اور جائیداد کے برتنے پر۔ بیوی پہلے تو میاں کو بیکرا لگتا ہو رہی۔ اس کے بعد فرض شریع

ہوا۔ اور نو بہت بہا شک پیچی کہ جو کچھ گھنا پاتا پاس نقا وہ اصل اور سود میں فنا ہوا۔ پیٹے

اور ہوکا یہ انجام دیکھ کر باپ اور ماں دونوں رنجیدہ ہوئے۔ باپ کی یہ خفگی اگر حسن کا

اپنی قوت بازو کا روپیہ ہوتا تو نشانیاں دیکھ کر بیوی کی نگاہ میں زیادہ دقت نہ گزرتی۔ مگر اسے مصیبت

یہ آئی کہ خفگی نقطہ خفگی ہی تک محدود نہ رہی۔ بلکہ عمل میں بھی آگئی اور دونوں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ خود ہوئے مفلس قرضخواہوں کا ہوا اتفاقاً چھٹے چھوٹ گئے۔ اب بیوی کے سامنے میاں اور میاں کے سامنے بیوی تھیں۔ وہ اس کو گنہگار سمجھتا اور یہ اس کو۔ حسن پر یہ حیبت پہاڑ کی طرح گری، اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس نفیر کا سہمیا اس القاب کی وجہ اس بربادی کا باعث، بیوی اور صرف بیوی ہو۔ بابا پ اس کی بدولت چھوٹے قرض اس کے طفیل ہوا، تقاضے اس کے کارن ہوئے، یہ نانا کہ ترقی یافتہ انسان تھا۔ مگر خفا انسان۔۔۔ مجھ میں کیا جوڑی اور سمجھا جو آئی۔ بیوی سے پارہا نرمی سے اور استہنگی سے کہا بھی اور بتایا بھی کہ اب پہنچن بٹھنے والے اور یہ ڈھنگ ٹیکے والے نہیں۔ ہاتھ روکو اور دل مارو۔ قرضخواہوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے ایک ڈاکٹر کا خرچ وہ کر سیکھے لگی ہے کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتی صحت اگر اس قدر روپیہ خرچ کرنے سے میسر آتی ہو تو میری رائے میر قدرت سے زیادہ ظالم کوئی طاقت نہیں "مگر بڑھا ہوا دل، پڑا ہوا لپکا، بیوی کی سمجھ میں آتی کیا خاک اور سستا کون سمجھتے۔ حالت روز بروز رومی اور محالہ ساعت یہ ساعت خراب ہوتا گیا اور دن بھی آ پہنچے کہ قرضخواہوں کا نار صبح سے جو شروع ہوا تو شام تک نہ ٹوٹا۔ واقعات کی اطلاع بابا پ دونوں کو ہو رہی تھی انہوں نے حسن کو بار بار متوجہ کیا اور وہ متوجہ ہوا۔ مگر شاہ رخ کو متوجہ کرنے والا کون تھا یا ہوتا۔ انوار اس بل تھی ہی نہیں۔ اگر کوئی تھا تو سسے دسے کہ ایک بابا جو کچھ بھی سکھاتا اور کچھ بھی سکھاتا تھا۔ اور شروع شروع میں دو ایک دفعہ کہا بھی۔ مگر دیکھا ہے کہ اس اللہ کی بندی نے اس کان سنا اور اس کان اگر ادیا تبیل تو درکنار بحث پر تیار اور بگڑنے پر آمادہ ہو گئی تو گھٹتی سا دھلی۔ اور سمجھ لیا کہ جیسا کریگی ویسا بھرے گی۔

وقت تنگی بات ہے، ان ہی دنوں میں خاتماں کو نفس کا دورہ ہونا تھا۔ مگر بڑھا آدمی پرانی آنکھیں دیکھا ہوا آنا اور شتم شتم پکارتا رہا۔ جب بخار آنے لگا تو مجھ کو آنا

چھوڑا۔ اسباب پکانے والا کوئی نہ تھا ایکسا وقت توپوں کٹا کہ بہرے کے اندر چلی گئی بلبل کرکچ کر دیا گروہ کھانا ایک فقط نام کھاتے کا تھا گوشت ہے وہ خلا ہوا۔ شور باہر ہے وہ ہساندا رہے چادر وہ گاتھی تھی اور کچے بھی۔ شاہد کے کسی جگہ نہ لکھے۔ دو ایک سے باقی بھی کہا۔ مگر بازار کی ترکاری یا گلی کا سودا نہ تھا کہ دام بھیجے اور منگوا لیا۔ دوسرے وقت شاہد کو خود پکانا پڑا۔ یہ پہلا دن اور پہلا موقع تھا جہاں شاہد کی حیثیت کے تین تین ہنڈیوں کا مصالحہ پیسے۔ بہرے کو دیا تو دوسری ہڈی اور چلی سو کھانا نوک زہر خود پیسے بیٹھیں مگر جس کا کام اس کو سہاویس کہنوں تک مرچیں لگ گئیں اور پھر بھی کھانا ڈھنگ کا نہ جڑا متواتر چار پانچ وقت یہی مصیبت تھی۔ شاہد کا سمجھ رہی ہو کہ میں نے میاں کو دل لے لیا اور احسان کیا کہ عمر بھر کان نہ ہلا سکے۔ دونوں وقت اس گری میں کہ آگ کی طرف دیکھا نہ جائے کھانا پکا رہی ہوں مگر حسن خیال کر رہے کہ ایسی عورت بھی کس کام کی جس کو کھانا تک پکانا آتا ہو۔ شاہد جلی ہوئی حسن بھلا ہوا۔ دینے نہیں غبار دونوں کے۔ وقت کی دیر اور موقع کی ضرورت تھی کیفیت اس وقت دونوں کی یہ تھی کہ چھوڑا پکا یا تھا۔ شتر دیا اور پھوٹا۔ شادیر پانچواں روز تھا کہ حسن کھانا کھانے بیٹھا۔ شور سب کا پہلا ہی چھپ لیا تو جھکنا نہ سہجے اور شور دیا دونوں چھوڑا گئے۔ چادر لیں پر جھکا تو پچھپچھپ۔ کہا ب کو جھپکا تو پچھپکا۔ کہنے لگا۔

”یہ پانچ روز سے متواتر فاقے پڑ رہے ہیں اگر یا در چلی بیمار پڑ گیا تو اب بھوکا ہی مریں۔“

شمار ۵۔ ”بادر چلی کی بیماری کی جس قدر میں ذمہ دار ہوں اسی قدر تم۔ کچھ کے اگر تم ہوتو میں بھی ہوں۔ افسوس ہے تمہاری طبیعت پر اور جس سے زیادہ تمہاری قدرانی ہے کہ آج یا پھر دوسرے میں خود کشت سے سخت مصیبت اٹھ کر بعض تمہارے واسطے چرلے گئے آگے مریں ہوں۔ بچائے اس سے کہ تم نہ کر گئے اور اسی شکایت کرتے ہو۔“

حسن۔ ”تم کیسی خوب باتیں کیا کرتی ہو یہ تمہارا فرض ہے کسی پر احسان نہیں ہیں تمہاری فاد میں پوری کرتا ہوں۔ یہ یہ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ کیا تم پر احسان؟“

اسی طرح اگر تم کھانے کا انتظام کرو۔ یا خود پکاؤ۔ یہ تمہارا فرض ہو اور ہونا چاہیئے۔
شاہدہ۔ ”تو کیا بیویاں اس لئے کی جاتی ہیں کہ وہ چوٹے میں ٹھکیں
 اور بھاڑ میں بھنیں۔“

حسن۔ ”یہ میرا مطلب نہیں ہے۔ اگر کھانا پکانا یا پکوانا ایسی سخت مصیبت
 ہے تو اس سے بہت زیادہ مصیبت کے کام مرد بھی کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں
 سمجھتے کہ عورتوں پر احسان کر رہے ہیں۔“

شاہدہ۔ ”تمہاری گفتگو ایسی تیز ہے کہ افسوس میں برداشت
 کے واسطے تیار نہیں۔“

حسن۔ ”تمہاری حالت اس قدر خراب ہے کہ مجھ میں اب سہار کی ہمت
 نہیں۔“

شاہدہ۔ ”اس کا فیصلہ یہ بہتر ہوگا کہ تم اپنے گھر خوش‘ میں اپنے۔“

حسن۔ ”اگر یہ ہی بہتر فیصلہ ہے تو سر آنکھوں پر۔“

شاہدہ۔ ”خیر مجھے زیادہ بحث کی ضرورت نہ فرصت۔“

[اتنا کہہ کر شاہدہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرہ میں آ بیٹھی۔ سوچنے لگی کہ

چھ چھ مہینہ سے حسن کا مزاج آسمان پر ہے۔ میرا کہیں جانا اسے ناگوار کسی سے ملنا
 اسے ناگوار۔ حد یہ ہے کہ میرا کپڑا میرا خرق میرے لوکر چاکر کوئی بھی اسے گوارا نہیں۔ مجھے
 معلوم ہے کہ وہ شہر سرسبز مگر خدا نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ میں بیوی ہوں مگر لونڈی نہیں۔

حسن نے اپنے دل میں سمجھا کیا میں اسے وہ مزاحیہ دیکھاؤں کہ عمر بھر یاد کرے۔ اس کا کیا
 قصور۔ قصور مسلمانوں کا جو وہ بھی آخر مسلمان تھا۔ مسلمان نکلا۔ سنتا ہی دیکھتا ہی کہ عورت
 لونڈی اور ہر بیوی باندی۔ جب ہم اپنی حالت درست نہ کریں اور مردوں کو نہ بتا دیں کہ ہم
 بھی کچھ طاقت رکھتے ہیں تو شکایت فضول۔ اگر آج تمام مسلمان عورتیں یہ معاہدہ کر لیں

کہ وہ زندگی کے ہر معاملہ میں مردوں کے ساتھ برابری کی حالت قائم رکھیں گی تو چاروں
میں مردوں کے تنگلے سکے سے بلی نکل جاتے ہیں۔ خیر میں اس کا اعلان کرتی ہوں اور ضرورت
ہے کہ خودکشی کر کے ایک ایسی مثال قائم کروں کہ مرد آئندہ ہر عورت سے بات کرتے
ہوئے تھکرائیں۔ یقیناً میری موت بہنوں کے واسطے مفید ہوگی۔ مگر بایں اس سے
حسن کا کیا بگڑے گا۔ وہ توہین سے اپنا گھر بسا لیگا۔ اس کو عورتوں کی کیا کمی۔ مجھ کو
اپنے طبقہ سے یہ اُمید نہیں کہ میں توان کے واسطے اپنی جان گنواؤں اور وہ صرف اتنا
ہی انتظام کر دیں کہ حسن کو بیوی نہ ملے۔ خدا سمجھے ان کج بخت مسلمانوں سے کوئی کام ہو
آپ کرتے ہیں نہ دوسرے کو کر نے دیتے ہیں۔ ہاں تو یقیناً میرے ساتھ ہوں گی اور
حسن کو بیٹی نہیں مل سکتی مجھے اُمید ہے کہ ایک سالانہ جلسہ میں یہ تجویز بھی منظور ہو سکتی ہے
مگر بیٹی پر باپ کا بھی تو حق شرع اسلام نے لگا دیا ہے۔ سینکڑوں باپ شادی پر
رضامند ہو جائیں گے۔ اور بل بل کرتے بیٹی دیں گے۔ خیر ملنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے
زندہ رہنا اور اس کو مزہ چکھنا نا چاہیے۔ یہ نامکن ہو کہ حسن میری زندگی میں دوسرا
نکاح کر سکے۔ میں وہ مسلمان عورت نہیں کہ اس کو ہر کوئی ہنسی خوشی پی لوں۔ لیکن میرا
اب اس کو ہنسی میں رہنا کچھ ٹھیک نہیں۔"

انا کہہ کر شاہل کے کچھ سوچا اور یہ کہتی ہوئی اُٹھی "ضرور ضرور"۔
 ایک چھوٹا سا قیلا پتھر سے کا ہا تھا میں اور بچہ کو ساتھ لئے 'برقع' اوڑھ لکھ کر
 گاڑی چھوڑ کر یہ کی گاڑی میں بیٹھ 'سیدھی کلب پہنچی۔ کچھ دیر ٹھہر کر 'ٹیشن آئی اور ایک
 سہیلی سے ملنے دوسرے درجہ میں بیٹھیا۔ جہاز آباد روانہ ہوئی۔ گاڑی کا ہندوستانی محافظ
 دیکھ تو بہت دیر سے رہا تھا۔ مگر انا سنتے ہی :-

”ہم کو باقی کی ضرورت ہے“

بہتے نڈا لٹا لپکا اور فوراً پانی لے کر حاضر ہوا۔ شکریہ ادا ہوا۔ ایک آدھ روپایا بھی ہوئی۔

اور اب سلسلہ یہ شروع ہوا کہ جہاں گاڑی کھڑی کسی نہ کسی بہانے کسی نہ کسی ضرورت سے آتا اور ایک آدھ بات بوجھ پاچھ چلا جاتا۔ شاہدہ کو اس سسے پہلے سیموں سے ملنے کا اتفاق تو بہت ہوا تھا۔ اور وہ ان کے خلق کی بہت مداح تھی۔ مگر آج صاحب کے اخلاق کی بھی داد دینی پڑی۔ جو ٹھینک یو ٹھینک یو میں ادا ہو رہی تھی۔

صاحب کو بھی احمد آباد تک گاڑی کے ساتھ جانا تھا۔ اور یہ معلوم کر کے کہ لشکار بھی وہیں جانا ہے۔ اور یہ بے وارٹی اپنی سہیلی مسٹر نصیر یوسف کے ہاں جاتی ہے کہنے لگا۔ ”آپ تو میری بہن ہیں۔“ مسٹر نصیر میری حقیقی بہن ہیں۔ اب آپ کو تار دینے کی ضرورت نہیں۔ پروانہ کیجئے۔ میں حاضر ہوں۔“

اب شاہدہ کو پورا اطمینان ہو گیا۔ احمد آباد پنچ ٹرین سے اتر گاڑی میں بیٹھا ایک مکان میں جا اتریں۔

شاہدہ۔ ”برادر! اس گھر میں عورتیں مطلق نہیں۔ مسٹر نصیر کہاں تھیں؟
برادر۔ ”وہ ایک شادی میں گئی ہوئی ہیں میں نے بلائے کو آدمی بھیجا یا ہے۔“
شاہدہ۔ ”اوہ! آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ ٹھینک یو۔ ٹھینک یو۔ ٹھینک یو۔“
برادر۔ ”نہیں نہیں مسٹر تکلیف کی کچھ بات نہیں۔“
شاہدہ۔ ”مگر اور کوئی بھی یہاں نہ رہا سب چلے گئے۔“

برادر۔ ”حقیقی بھتیجے کی شادی ہے۔ وہ آجائیں تو پھر میں بھی جاؤں۔
دوروز کی چھٹی میں نے بھی اسی واسطے لی ہے۔ آپ غسل کر لیجئے یہ سائے غسل خانہ ہے۔
میں باہر چلا جاتا ہوں۔“

برادر باہر آکر ٹیٹے لگے۔ دو تین گلاس پئے۔ شاہدہ اندر جا کر نہائیں۔ دو جوڑے سانچے تھے۔ کپڑے، برے بال درست کئے اور مسٹر نصیر کا انتظار کرنے لگیں۔
انور گاڑو کیسا ہی ہشیار ہو رہا۔ مگر شاہدہ بھی زیادہ بیوقوف عورت نہ تھی۔

آٹھ بجے گاڑی سے اُتری۔ جب رات کے گیارہ بج گئے اور اُس نے دیکھا کہ عورتوں کا پتہ نہیں۔ اور یہ کہ عشتا پیٹا پکڑے پکڑے پھر رہا ہے۔ تو اٹھا ٹھنڈا۔ کچھ دیر ٹہلی اور سوچا۔ گھڑی دیکھی تو بارہ بجنے واسے تھے۔ اب انوکھا لیکر آیا تو سب بازار کا رشتہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ کھانے کے شہ کو لپٹن بنا دیا۔ (اُن کسی ضرورت سے باہر گیا وہ تین گلاس اور ڈائے۔ شاہد کے لئے یہ موقع غنیمت سمجھا اور جھٹا دروازہ بند کر کنڈی لگالی۔ افسر یہ رنگ دیکھ کر بہت سٹ پٹا یا۔ منت کی، حاجت کی ڈر یا دھمکا یا۔ اور جب کچھ بس نہ چلا تو کہنے لگا ”بیٹے وہ آگئیں۔“

”آگئیں دروازہ کھولئے۔“

شاہد۔ ”ان کو دروازے تک آنے دیجئے۔“

الور۔ ”آپ دروازہ تو کھولئے۔“

شاہد۔ ”ان کو آنے تو دیجئے۔“

کوئی گفتہ بھرتک یہ بحث ہوتی رہی۔ جب افسر بالکل ہی ناامید ہوا تو دبا کر دو گلاس اور پینے اور کوٹے پر چڑھ کر چھوٹی چھت پر آدھم سے نیچے۔ اب شاہد کا تھر تھر کا ٹپ رہی تھی۔ جس قدر منت پہلے افسر نے کی اتنی بلکہ اس سے ڈگنی شاہد کے لئے کی۔ مگر جس طرح وہ بے سود ہو گئی۔ اسی طرح یہ بیکار۔ افسر شراب کے نشے میں پُور تھا۔ آگے بڑھا۔ چلانا چاہتی تھی کہ ظالم نے سوتے بچے کو گردن سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ روتی دھڑا دھڑا رہی تھی۔ دیکھتی ہے تو تیز چلا افسر کے ہاتھ میں موجود ہے۔ کچھ بے خبر ڈرا سوتا تھا۔ اس ناگہانی مصیبت سے آکھ کھل گئی تو ظالم کے پنجہ میں تڑپ رہا تھا!

الور۔ ”اگر تیرے دل میں رحم نہیں ہے تو میں اپنی جان پر کھیلتا ہوں۔ مگر سب سے پہلے تیری آنکھوں سے ساتتے تیرے کلیجے کے ٹکڑے کو گیری کی طرح ذبح کر دوں گا۔ یہ

صحن اسن صدم کے خون سے اور تیرے پکڑے اس سے لال ہوتے ہیں۔“

بچہ نے حسرت بھری نظروں سے ماکو دیکھا۔ گرفت نشہ کی تھی۔ غصہ کی تھی۔ سخت تھی۔ مصدم آنکھیں نکلی پڑتی تھیں۔ مگر آواز نہ نکلتی تھی۔ یہ بس تھا، مجبور تھا، لاچار تھا۔ نیم ترقی یافتہ ماں کے سوا صرف نیم کی پتیلیاں اور آسمان کے تارے اس وقت تک منظر کو دیکھ رہے تھے۔ عجب وقت اور نازک حالت تھی۔ جانتی تھی کہ شہرِ پیب پھول اس جفا کار کے ہاتھوں پا مال ہوگا۔ انسان کی ماری بلبلاتی تھی۔ گڑ گڑاتی تھی۔ تڑپتی تھی۔ روتی تھی۔ یہاں تک کہ چاقو کی دھار مصدم کیلچہ کے پاس چکی اور اس چمک نے نصیب ماکو فریبی برادر کے قدموں میں گرا دیا۔ روتی، اور رو کر کہا "بھوپہم کر، یہ تیرے بچوں میں کیا بچا ہے۔ دو گند کر یہ صورت اتنی دیکھی ہے۔ میں وہ بن نصیب ہوں جو اپنے ہاتھوں وہ تقدیر پھوٹی ہوں جو اپنی نقل سے اس آنکھوں کے تارے کو پھولوں کی بیج سے اٹھا کر اس مقل میں لائی۔ اور اپنی نادانی کی بدولت اس بیگناہ ہستی کو تیرے قبضہ میں دیدیا۔ دیکھ اظالم اس بچہ کو دیکھ ابہر رہا ہے، چھوڑ دے لٹش میرے بچے کی گردن آزاد کر دے۔ یہ بیگناہ مصدم دھل رہا ہے۔ اس کا دم نکل جا بیگا۔ اس کا گلا گھٹ رہا ہے۔ اسکی جان نسا ہو جائیگی۔" اٹور۔ "مگر میری حالت اس سے بدتر ہے۔ تڑپ رہا ہوں، مر رہا ہوں۔ تیرے قدموں میں سر ہے۔ تیرے ہاتھوں میں زندگی ہے۔ رحم کر میں اس سے بہت زیادہ رحم کا مستحق ہوں۔"

نشا بہرہ۔ "چھوڑ دے۔ اودغا باز چھوڑ دے۔ اور مکار چھوڑ دے۔ دیکھ اسکی آنکھیں نکل پڑیں۔"

اٹور۔ "کبھی نہیں، ہرگز نہیں تو کفر ہے، تو پتھر ہے۔ تو اس سے زیادہ سزا کی مستوجب ہے۔ دیکھ کیا ہوتا ہے اور کیا ہوگا اگر یہ دانش تیرا بچہ ہے، اور تو اس کو بچانا چاہتی ہے۔ تو یہ گھر اور اس گھر کا مالک دونوں تیرے غلام ہیں تو یہاں وہ آرام کر۔ حکومت کر خوش رہ، اور خوش رہنے دے۔"

نشاہدہ۔" تو اس پر نصیب پر اور اس بیوقوف پر جو محض اپنے نتیجے میں گھرتا
مکمل کھڑی ہوئی رحم کر اس بچہ پر جس کا باپ موجود۔ اس عورت پر جس کا شوہر زندہ اس پر
جو شریف کا بچہ اس پر جو بیس کی بیوی ہے۔ رحم اور اپنی شرافت سے مجھ کو وہ وقت نہ
دکھا کہ میں دنیا سے نامراد رخصت ہو جاؤں۔ میں اب بھی اگر ایمان کوئی چیز ہے تو عزیزوں کو
منہ دکھانے کے قابل نہیں ہوں۔ میرا کلیجہ نکل رہا ہے۔ میرا سر تیرے قدموں میں ہے
اپنے قصد سے باز اور اس بچہ کو چھوڑ دے۔"

رات کا پچھلا پہر تھا۔ خلق خدا نیند کے مزے لے رہی تھی۔ مغرب کی اندھا
یوہند تقبیل کرنے والی نیم یافتہ لڑکی کی آواز نہ ہوا میں گونجی۔ اس کے پاس اس کے سوا
کیا تھا کہ پڑوسیوں کی در دے۔ چیتا شروع کیا۔ لوگ دوڑ پڑے، دروازہ بند تھا
توڑا اندر گھسے دیکھا افواہ نشہ میں چور عورت حیران، بچہ بے ہوش، حال پوچھا۔
افسوس کیا اور معاملہ پولیس کے سپرد ہوا اور افواہ کو سزا ہوئی۔
فیصلہ کا ایک حصہ جو جج نے لکھا یہ تھا:-

"عورت کی داستان نہایت درد انگیز ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ترقی
کی دھن اور تعلیم کے شوق نے اس کو یہ دن دکھایا مگر ایسا کہنا تعلیم پر
زبردست حملہ ہو گا۔ مسلمانوں میں تعلیم نسواں کا حکم صاف ہے اور
ان کے ہاں ایسی ایسی عورتیں گزری ہیں جن کے سامنے جید سے جید
عالموں کی گردنیں ہمیشہ جھکیں مسلمان قوم ان بانیہ ناز خواتین کی ہستی سے
برپز ہے جن کے نام بساط علم پر آفتاب و اہتاب کی طرح چمکے اور ان کے
جب رقت نے ان کی حکومت کا پاسہ پٹا اور حاکم سے محکوم، بادشاہ
سے رعیت، اور امیر سے فقیر ہو گئے اس وقت ان کے پاس صرف
ایک چیز رہ گئی۔ جو عورت کی عصمت تھی۔ اب ان کی تمام توجہ اس طرف

مبذول ہوئی۔ قانون ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اور وہ سزائیں جو اسلام نے ان جرائم کے واسطے مقرر کی تھیں۔ ان کی دسترس سے باہر تھیں۔ اس لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ پردہ کو سخت کریں۔ اور اس طرح خواتین کو ایسے مواقع میسر نہ ہونے دیں جو اس قسم کے جرائم کے محرک ہو سکیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح انہوں نے عورت کو اس آزادی سے کچھ نہ کچھ محروم کر دیا جو اسلام نے اس کو عطا کی تھی۔ مگر اس کا معاوضہ انہوں نے دوسری صورت میں کیا۔ اور اس کا اعزاز و احترام اور اعتبار سے بڑھا کر اس کی کمی کی تلافی کر دی۔ کچھ دوسری قوموں کے میل جول کا اثر تھا کچھ وقت کا مطالبہ۔ اب مسلمانوں میں ایک فریق ایسا پیدا ہوا جس نے اس تجویز کو غلطی پر عمل کیا اور سمجھا کہ ہماری عورتیں جاہل ہیں۔ ان کو پڑھا لکھا کر دینی حق دینے چاہئیں جو عطیہ اسلام ہے۔ اس مقصد کے واسطے انجمنیں قائم ہیں۔ اور اخبار کا کام کر رہے ہیں۔ مگر اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصول مذہب اس فریق کے پاس سے رخصت ہوا اور اس زبردست قربانی کے بعد بھی ان کو جو کچھ میسر آچکا وہ صرف اتنا کہ اردو کی دوچار اٹی سیارہی سطر لکھ سکیں۔ اسی کوشش کا نتیجہ یہ بد نصیب ماں شاہدہ بھی ہے۔

پندرہواں باب

ایسی ناہنجار لڑکی خدا دشمن کو بھی نہ دے۔ سچ بولچو تو کلمہ اور برادری کیا تمام دنیا میں ناک کٹ گئی۔ ایسا واقعہ میں نے تو کبھی عمر بھر سنا نہیں جو خدا نے اپنی آنکھ

از علامہ راشد لچیری

سے دکھایا۔ میرا بس چاہتا تو اس سناھل کا نامرا کو نصیر آباد ہی میں دفن کر دیتا۔ یہ تمام نتیجہ تہاری غفلت کا ہے کہ تم اس سے ہمیشہ الگ رہیں اور ان کجحت نرسوں مسوں نے اپنے رنگ پر ڈھال دیا۔

بیوی۔ ”اگر تمہاری یہ رائے ہے تو بیچ ہوگی۔ میں اس کا کیا جواب دوں۔ جس روز سے سنا ہے جو کچھ دل پر گزری ہے۔ میں ہی جانتی ہوں۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر ہے۔ حرام موت نہ ہوتی تو میں تو کچھ کھا کر سو رہتی۔“

میاں۔ ”غضب یہ ہے کہ اب بھی کجحت کی آنکھ میں نیل اور تیوری پر نیل نہیں۔ وہی کٹا، اور وہی زبان۔ اگر تعلیم کا انجام یہ ہے تو یقیناً تعلیم حرام۔“

بیوی۔ ”تعلیم کا نتیجہ ہرگز یہ نہیں ہو سکتا۔ یوں کہو کہ طریقہ تعلیم مستحسن نہیں۔ جس طرح تعلیم دینی چاہیے اس طرح نہیں ملتی۔ اور جو ڈھنگ نہ رہیے ہیں انہیں سے کام لیا جا رہا ہے نتیجہ تو یہ ہونا ہی ہے۔“

میاں۔ ”یہ تہاری شاگردیں کجحت اس قدر چلاتی ہیں کہ بات کرنی بھی تو مشکل ہو۔ ذرا ان کو خاموش کرو۔ کان کے پردے پٹے جاتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اس میں کیا مصلحت ہے کیا تم کو استغاثی گری کی روٹی کھانی ہے جو یہ اتنی ساری پال رکھی ہیں۔ پڑھانے لکھانے کا نتیجہ آنکھ سے دیکھ لیا، کان سے سن لیا سب تو یہ سلسلہ ختم کرو۔ تمہارے یہاں یہ خاندانی مرض ہے۔“

بیوی۔ ”یہاں تک نوبت پہنچ گئی اوساب تک تم معاملہ کی تہ کو نہ پہنچے۔ اس تعلیم کا نتیجہ خراب نہیں ہو سکتا۔ یہ اسلام کا عین منشا اور ہماری ضرورتوں کے قطعی مطابق ہے۔ لڑکیوں کو بھی خاموش کر دیتی ہوں۔ مگر اس طریقہ کو قابل اعتراض سمجھنا غلطی ہے۔ مبارک ہے وہ گھر جہاں خدا کے مقدس الفاظ کا نور میں آئیں اور عاجز بندے اس بر دست طاقت سے سلسلے عجز کی زبان کھولیں۔ یہ تعلیم ان کی دنیا اور دین دونوں

کی فلاح کا باعث ہے۔ خرابی آن کر یہ پڑی ہے کہ تمہارا وہ فریق جو تعلیم جدید کا دلدادہ ہے اصلیت پر غور نہیں کرتا۔ تم جس بہتر سے بہتر ادا علی سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کو چاہو لا کر ان سے مقابلہ کر دو تم کو معلوم ہو جائیگا کہ تعلیم نسواں جائز بلکہ ضروری اشد ضروری مگر طریقہ تعلیم یہ متحسن الودہ مکروہ۔“

بیوی کی گفتگو بھی پوری طرح ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک لڑکی سامنے آئی اور کہا کہ ظہر کی اذان ہو رہی ہے۔“

بیوی۔ ”تم نے دیکھا اس کی عمر مشکل سے سات برس کی ہوگی مگر اس کے دل میں نماز کا شوق اس قدر کیونکر پیدا ہوا۔ اصل میں نماز کے بعد میں ان کے سامنے کہانی کے طور پر کچھ گزشتہ واقعات بڑی بوڑھیوں کے جوہر سے دیکھے اور سنے بیان کیا کرتی ہوں۔ اس وقت تو یہ کہانیاں ان سے نماز پڑھواتی ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ عادت ان کی طبیعت میں رفتہ رفتہ اس قدر پکٹی ہو جائے گی کہ خواہ دنیا کی کوئی چیز بہتر سے بہتر ان سے چھوٹ جائے۔ مگر نماز نہ چھوٹے گی۔ اگر تم کو فرصت ہو تو آؤ آج اس چھوٹے سے مکتب کا بھی نمازنا دیکھو۔“

لڑکیوں نے جیسا چھپ و ضرور کئے۔ قرآن شریف جزا ان کر الماری میں رکھے۔ تختیاں کونڈیوں میں کھڑکی کیں۔ اور کہا استانی صاحب بی بی فوہر کا حال آگے فرمائیے۔“

استانی۔ ”ہاں تو سٹیو! خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے۔ جب ان کے میاں کی آنکھوں میں پانی اتر آیا اور چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے تو نوکری جاتی رہی۔ دن بھر گھر میں سرمہ اونڈھائے اٹوائی کھٹوائی لئے پڑے رہتے۔ مرو کی عزت کمائی سو ہے۔“

جیسا اس قابل نہ رہے تو وہ غصہ غنیمت سب جاتا رہا۔ بچے سر پر جھینے اور بچا رہے اُف نہ کرتے۔ یاد وہ بنا دھانڈھی کہ اوہرا نہیں نے گھر میں قدم رکھا اور اوہر بیوی ہال بچوں کے منہ سل گئے یکس کی اتنی مجال تھی کہ سانس بھی دُور سے لے لیتا معلوم ہوتا تھا

نادر شاہ بیٹھے ہیں۔ یا اب یہ کیفیت ہوئی کہ لڑکے اور لڑکیاں سر پر ڈھنڈورہ پیٹ رہی ہیں۔ اور وہ پڑے سُن رہے ہیں۔ ساتھ روپے ہینہ کے نوکر رہے اور اوپر کی بھی تھوڑی بہت آمدنی تھی۔ مگر ایسے فضول خرچ اور اتنے بے ڈھنگے کہ کبھی وقت بے وقت کے واسطے کچھ رکھا ہی نہیں۔ ایک یہ مرض تو بارہ ہینے کا تھا کہ کبھی گھر میں خالی ہاتھ نہ گئے۔ فصل کی تزکاری اور موسم کا مہودہ روال میں ضرور ہوتا تھا۔ رات کا دودھ کبھی ناغہ نہیں ہوا۔ وہ بھی یہ نہیں کہ گھر میں دُسل بچے رات کے چھ پیسے روال میں باندھ سبب سے حلوائی کی دکان پر۔ دو چار بار دوست اور بہن ادھر ادھر کی باتیں کر رہے ہیں۔ اور سڑک پر کھڑے دودھ اڑا رہے ہیں۔ پی چکے تو سوتے اپنا اپنا کلہاڑا پھینکا۔ جس کی آواز دور کی ہوئی وہ ہی اپنے فن کا اُستاد مختصر یہ کہ اتنی چپائی روپیوں میں بیوی فوس کے پلے کوئی پچاس روپے پڑتے ہونگے۔ پانچ بچے دو میاں بیوی ایک بڑھیا ماما آٹھ دم تھے۔ لاکھ سستا سماں اور بھلے دن تھے۔ مگر گھڑا لٹا کھانا پینا پیسے دم کے ہزار خرچ تھے۔ بچاری جس طرح ہوتا شتم شتم گزر کر تباہاں موقعہ چپ لٹا۔ رنج و کینٹیں یہ ہینہ کہتیں کہ خدا کی واسطے کچا سا تھو ہے۔ وورڈ کیاں آگے ہیں اس کھانے پینے کو کون دیکھتا ہے۔ کچھ تو آگے کی بھی سوچ کر دے۔ مگر وہ اللہ کے بندے تو ایسے کانوں میں روئی تھوٹ کر بیٹھے کہ کبھی دھیان ہی نہ کیا۔ نوکر سی گئی تو کل تیرہ روز کی تنخواہ چڑھی ہوئی تھی۔ وہ کے دن کی۔ اب پانی اُترا تو انھیں کھل گئیں۔ بیوی سے کچھ بولنے تو کس منہ سے اور بچوں سے کہتے تو کس برتنے پر۔ چھکے پڑے رویا کرتے۔ ساری رات جاگتے اور اپنی غلطی پر پیتاتے۔ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ بیوی کے جب تک میاں نوکر چاکر ہے اکثر ان سے ناخوش رہیں اور ان کے ان ڈھنگوں کو کبھی نہیں پست نہ کیا مگر میاں کا اندھا ہونا تھا کہ وہ پاؤں کی خاک ہو گئیں۔ کیا کوئی لونڈی یا ماما خدمت کرے گی جو انہوں سے لے کی۔ بیوی کی یہ اطاعت دیکھ کر میاں کا کلیجہ منہ کو اتار۔ صبح کی

نہایت کا سلام پھیر دوا پیسنے بیٹھ جاتیں اور میاں نے آنکھ کھولی اور انہوں نے
گلی کو پانی دیا۔ اور دوائی پلائی۔ جاڑوں کے دن تھے۔ اپنے ہاتھ سے دھوپ میں لیجا کر
بٹھاتیں اور اپنے ہاتھ سے اندر لیکر لٹیں۔ اس اطمینان سے میاں کے دل میں ایسا گھبراہٹ
کہ وہ ان کے پاؤں چومتے اور کہتے کہ جنت کی حوریں بھی تم سے بہتر نہ ہوں گی ایک روز کا
ذکر ہے تہجد کی نماز پڑھ کر اٹھیں کہ میاں نے کروٹ لی۔ کہنے لگیں:-

”کیا جاگ رہے ہو کچھ کام ہے؟“

میاں:- ”کیا خاک جاگ رہا ہوں تقدیر کو رو رہا ہوں یہ فقیر اس پانی پلا دو۔“
بیوی:- ”کیوں رونے کی کیا بات ہے خدا کا کٹ کر کرو کہ عزت آبرو سے گھر
میں بیٹھے ہیں۔ لو پانی پیو۔“

میاں:- ”میری حالت اب یہ ہو گئی ہے۔ کہ تم سے کوئی کام لینے ہوئے
بھی مجھے شرم آتی ہے۔ دن رات اسی فکر میں رہتا ہوں کہ کیا کروں۔ ایک پیسہ کی آمدنی
نہ رہی۔ شاہانہ سے تم کو اس طرح گزار رہی ہو۔“

بیوی:- ”تم کس قسم کی باتیں کیا کر رہے ہو۔ تمہیں شرم کس بات کی؟ میں ہوں
کس واسطے؟ جو کچھ کر رہی ہوں یہ میرا فرض ہے۔ روپیے کی ضرورت سے تم زیادہ فکر
نہ کرو۔ میں ہنیشہ یہ کیا کرتی تھی کہ جو روپیہ تم میرے ہاتھ میں دیتے تھے فی روپیہ ایک آٹہ
الگ کر دیتی تھی۔ ایک پیسہ اللہ کے نام اور تین پیسے محفوظ۔ جب پانچ روپیہ ہوتے
تو پیسے دیکر روپیہ بنوا لیتی تھی اور ڈال دیتی تھی۔ اب جو ہیں نے دیکھا تو خوار نے
یہ برکت دی کہ سات سو روپیہ ہو گئے۔ بیٹی والے سینٹھوں کی بیوی پرسوں کہہ رہی تھیں
کہ تم وہ روپیہ دیدو میں بیچ میں ڈالوا دیتی ہوں میں روپیے مہینہ کے مہینہ سے جانا اب اگر
تمہاری اجازت ہو تو دیدوں انہیں تو یہ روپیہ حاضر ہیں جو تمہاری صلاح ہو وہ کر دوں۔“
میاں:- ”میرا تو منہ نہیں جو تمہاری تعریف کروں خدا قسم جیسا بیویاں دنیا کو دے

بہنٹی والا سبب نہایت ایمان دار آدمی ہے۔ تم فوراً روپیہ دیدو۔ بلا سے ہم کو تو پینیس روپیہ میں اشرافیاں ہو جائیں۔“

پیارے بچہ! یہ بیوی تو اس کا سلیقہ تھا کہ اسی میں روپے میں انہوں نے گھر کا خرچ بھی پہلایا۔ ایک سا بیٹی تھی بیابھی اور دنیا کے سب کام کاج کئے۔ لاکھ روپے کی بات جو انہوں نے کی وہ یہ تھی کہ اس مفلسی میں گھر کی ہوانہ بگڑنے دی۔“

سودھوال باب

کچھ وقت کا مطالعہ تھا کچھ پہاڑ کی آب و ہوا کا اثر زاہد کا شوہر چراغ پا تو ہو ہی چلا تھا۔ اس صحبت بھی ان لوگوں کی ملی جو دن رات فیشن کا کلمہ پڑھ رہے تھے۔ آمدنی مستویل تھی۔ آنکھیں کچھ اور ڈھونڈنے لگیں۔ گھر گھر کی حالت۔ درمی۔ چاندنی برتن بھانڈا سب چیزیں زیرِ نقض حد یہ ہے کہ گھر کے ساتھ گھر والی بھی آنکھوں کو ناگوار ہوئی اور جی چاہا کہ گھر بدلے اور ساتھ ہی گھر والی کی بھی تبدیلی ہو خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو تعلیم یافتہ بیویاں میسر آتی ہیں۔ اور جانتی ہیں کہ زندگی کس طرح بسر کریں۔ ان کی ہر ادا ان کی ہر کوشش، ان کا ہر فعل، ان کا ہر قول طبیعت کو خوش اور دل کو چوچل و مارغ کو نازہ اور شوہر کو باغ باغ کر دیتا ہے۔ کاش میری تقدیر میں ایسی بیوی ہوتی۔ اور میں بھی دنیا کا کوئی لطف اٹھا سکتا۔ آخر اسی بیوی کی بہن شاہنشاہ ہے میں نے صرف چوتھی واسے روز دیکھا تھا۔ صورت نکلی۔ بہت چیت نہ کپڑا اتنا اگہنا پاتا۔ بیج تو یہ کہ علم کی خوشبو اس کے ہر ذرہ سے ہلک رہی تھی۔ کیا خوش نصیب ہے اس کا شوہر جس کو ایسی بیوی ملی۔ ایکہ میں ہوں کہ سوا دنیا نوسی خیالات اور چہانت کی گفتگو کے کوئی آواز ہی کان میں نہیں آتی۔ مگر مجھے فکر کس بات کا۔ روٹی کپڑا دے جاؤنگا اور چیت دوسرا کج کر دینگا۔ کیا وہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہو کر ایک جاہل عورت کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرے۔

مجھ کو خدا کی اجازت خدا کے رسول کی اجازت اشد ضرورت پھر نہ کرنے کا سبب؟
 لڑکیوں کی کیا کمی احسان کے اس خیال کا زبان تک آتا تھا کہ خود ہی لڑکیوں
 کے درنا، بھٹی ہو گئے۔ اب یہ میاں کی عنایت سمجھو، انسانیت کہو، انصاف سے
 تعبیر کرو جو چاہے کہو کہ انہوں نے بیوی کو بھی اطلاع دیدی اور اس طرح کہا:-
 ”تم کو معلوم ہے کہ شرع اسلام نے مرد کو چار نکاحوں کی اجازت دی ہے۔
 میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے ساتھ میری زندگی بالکل برباد ہو رہی ہو۔ اور کوئی وجہ
 نہیں معلوم ہوتی کہ اس طرح یہ زندگی غارت ہو۔ مجبوراً میں نے کوشش کی ہو کہ ایک
 تعلیم یافتہ عورت سے عقد کر دوں۔ اور اس طرح کمی کو پورا کر لوں مگر میں تم کو
 یقین دلانا ہوں کہ تمہارے شرعی حقوق نہ بھولوں گا۔“

زراہدہ:- ”بیشک تم کو شرع نے اجازت دی ہے۔ اور مجھ کو اس میں دخل
 دینے کا حق نہیں۔ مگر میں اپنی محبت سے مجبور ہوں۔ اس کو آسانی سے برداشت
 نہ کر سکوں گی۔ تم شوق سے نکاح کر لو۔ مگر میری راسخے میں یہ مناسب ہو گا کہ تم مجھ کو
 چند روز کے واسطے گھر پہنچا دو۔“

احسان:- ”نہیں یہ مناسب نہیں ہو۔ رفتہ رفتہ سب باتیں گوارا ہو جائیں گی
 یہ خاطر جمع رکھو کہ تمہارے اعزاء و اکرام میں کسی قسم کا فرق نہ آئے گا۔“

زراہدہ:- ”یہ تو مجھے تمہاری عنایت سے آسہل ہے اور میں جانتی ہوں کہ تم
 پر دین میں میری بے وقعتی نہ ہونے دو گے۔ لیکن اس وقت تو اگر تم مجھ کو پہنچا دو تو اچھا۔“
 احسان:- ”بعض مصلحتوں کی وجہ سے میں اس کو پسند نہیں کرتا۔“

زراہدہ:- ”اگر تمہاری راسخے میں میرا یہاں کا قیام ضروری ہے تو خیر۔“
 احسان شادابی کی دھن میں مست تھا۔ اس کا دل تو یہ ہی چاہتا تھا کہ کسی بڑی
 کے سامنے پرانی کو دور کر دے۔ مگر ایک جھجک تھی کہ عزیزانِ ارب مستغرق نہ جائیں۔ اس وجہ سے

اس نے بیوی کا جانا مصلحت نہ سمجھا۔ اور یہی مناسب سمجھا کہ اس کو بیس تئیر کرے
شادی میں کیا ہاتھی گھوڑے گتے تھے۔ جگہ تجویز ہوئی، تار سچ ٹھہری۔ نکاح
ہوا، اور نئی دہن گھر میں آدھکی۔

یوں تو اس واقعہ کا ہر ٹکڑا کھلا ہوا ظلم تھا۔ مگر وہ ظلم جس کی تلافی نامکن تھی یہ
ہو کہ احسان نے بیوی کا تمام زیور نئی دہن کو چڑھا دیا۔ اندیشہ تھا کہ شاید میاں کی
یہ حرکت زاہرہ کو پسند نہ ہو۔ مگر نیک کوک کی بیٹی تھی انکار کیسا اور قاتل کس کا ہنسی
خوشی آگے رکھ دیا۔

نئی دہن کی محبت اور دہن بھی مغربی طرز کی تعلیم یافتہ جس کے میاں احسان
جو یاد اور آنکھیں متلاشی۔ جس قدر بھی ہوتی کم تھی۔ قدموں کے نیچے آنکھیں بچھانا اسکی
زبان سے کسی بات کے نکلنے کی دیر تھی تعمیل میں دیر نہ تھی۔ اب زاہرہ کی حیثیت صرف
ایک ماما کی تھی۔ آٹھ دن سر میں تیل ڈالنا گناہ تھا۔ البتہ تہائے کی عادت چونکہ بچپن
کی تھی۔ اس لئے نہ تو روز لیتی تھی۔ نہ کراٹھی اور وہی میلے کپڑے پہن لے۔ احسان
بیس روپیہ ماہوار بھی خرچ کرتا تو بھی زاہرہ جیسی ماما اس کو پسند نہ آتی۔ یہ وہ اچھی طرح
سمجھتا تھا لڑکانہ تھا، بچہ نہ تھا۔ اگر چھوٹا سوٹا بھی زاہرہ سے بات کرتا ہوں تو نئی دہن
سچ مچ مجھ سے بات نہ کریگی۔ مہینہ مہینہ بھر آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا۔ کھانا جو نئی دہن نکال کر دیتی۔
اور کپڑا جو وہ اپنے ہاتھ سے بنا دیتی۔ سر آنکھوں پر رکھتی۔ چھ مہینے اسی طرح بسر لے۔
اور اب سردی زور سے چکنے لگی۔

صبح کے وقت ایک روز احسان اچھا بچھا تھا۔ ہاتھ منہ دھو کر رسمہ کیا۔
مگر چار بجے کے بجائے ایک ہی بجے آگیا۔ اور آیا اس طرح کہ بخار میں لوتھ تھار شام
کو خفیف سی سینہ میں کسک معلوم ہوئی۔

دوسرے روز ڈاکٹر کو بلایا۔ اس نے نمونیا تجویز کیا۔ صبح کو حالت خراب اور

شام کو بستر اور چوتھے روز تو اتنی خراب تھی کہ بات تک ٹھیک نہ کر سکتا تھا۔ رات کو پھر ڈاکٹر آیا تو اُس نے کہا "طاعون کا بھار معلوم ہوتا ہے۔" اب مغرب زدہ تعلیم یافتہ بی بی کا کیا کام تھا۔ مرض منجھری میں ٹھہر کر خود مرض میں کیوں گرفتار ہوئیں اسی وقت برقع اوڑھ سیدھی ہوئیں۔

زاہرہ بچاری جاہل ٹھوٹا وہ مرض منجھری کو کیا سمجھتی۔ رات رات بھر میاں کی پائنٹی نہ چھوڑی۔

ایک رات کا ذکر ہے کہ احسان بے خبر بڑا تھا پچھلا پہر تھا۔ اور پردہ زمین کی خاموشی گھر کے کونے کونے سے ٹپک رہی تھی۔ "تارے جھللا جھللا کر بے ثباتی دُنیا کے نعرے لگا رہے تھے۔ چاندنی پھسکی پڑ چکی تھی کہ زاہرہ کے تخیل نے اس کو ایک دوسری دُنیا میں پہنچا دیا۔ اس کو شوہر کی موت کا یقین ہو گیا۔ اور وہ سوچنے لگی کہ دُنیا کی تمام خوشی زندگی کا مدار اس دم سے تھا۔ اس کی جھڑکی غیر کی عنایت سے اور اس کا غصہ دوسرے کے پیار سے بہتر جب یہ نہیں تو کچھ نہیں۔ میری جنت ان قدموں میں اور میری دُنیا اس صورت میں پوشیدہ ہے۔ میں بد نصیب تھی کہ جبکی خوشی پر راحت اور منخرفت کا انحصار تھا۔ اس کو خوش نہ رکھ سکی۔ بعض دفعہ کسی کسی سخت باتیں اور کہتے کہتے بیڑھے جواب دیتی تھی۔ مگر خدائے مہربان نہ رکھ سکی۔ سن کر چپ ہو جاتے تھے۔ اب یہ کہاں اور میں کہاں۔ میری زندگی برباد اور میری عاقبت ناراج ہوئی۔ میں نے کیا غضب کیا کہ قصور بھی تو معاف نہ کروالیا۔ اب دو گھنٹہ سے بات بھی نہیں کی۔ دو ایک نوک پلاؤں تین نچ چکے۔ آنکھ ہی ہیں کھولی۔ ہائے یہ سانس کیسا چل رہا ہے۔

زاہرہ گھر آ کر اٹھی آنکھ سے زار و قطار آنسو کی لڑیاں جاری تھیں۔ منہ

دیکھا اور بیباخانہ یہ کہہ کر باؤں پر گر پڑی :-

"مجھ لونڈی کا قصور معاف کرو"

آنکھیں تلوؤں سے مل رہی تھی۔ احسان کی آنکھ کھلی۔ بیوی کی محبت برجی کی طرح کلیجہ میں گھسنی اور ساتھ ہی نئی دہن کے چلے جانے کے خیال نے تمام حوصلے پست کر دیئے۔ زاہد کا اضطراب بجلی بن کر کلیجہ پر گرا۔ اس کا ہاتھ آنکھوں سے لگایا اور کہا:-
”مجھ سے غلطی ہوئی۔ اگر زندہ رہا تو عمر بھر پاؤں دھو دھو کر پیوں گا۔“

ابھی احسان کا شکر یہ ختم نہ ہوا تھا کہ مؤذن کی صدائے توحید نے رات کی خاموشی کا سلسلہ توڑا۔ اٹھی وضو کیا۔ نماز پڑھی اور شوہر کی صحت کیوا سنے کر گڑا کر خدائے واحد کے حضور بس روئی۔ وقت نہیں ہو کہ یہ کہا جائے کہ نماز کی دعا قبول ہوئی۔ مختصر یہ کہ دوانے انز کیا اور احسان کی حالت روز بروز سنبھلنے لگی۔

ٹوٹا باسن کسیرے کے سر جب تک احسان بیمار رہا زاہد کی ملکیت تھا۔ مگر تندرست ہوتا تھا کہ نئی دہن مع اپنے تمام حقوق کے گھر میں آتیں۔ زبردست کے بسوے بیس زاہد کا پھر وہی ماما تھی۔ اور نئی دہن گھر والی۔ احسان اگر ذرا عقل سے کام لیتا، اور غور کرتا تو واقعات آنکھ کے رو برو تھے۔ مگر بیعت ٹھوکر کھا کر بھی نہ سنبھلا۔ اب نئی دہن کو زاہد کی زندگی ایک کاٹا تھا۔ جو ہر وقت دل میں کھٹک رہا تھا۔ لاکھ وہ دب چکی تھی اور اگر گھر سے اب اس کو واسطہ تھا تو صرف چوٹے سے۔ مگر چاتر کی دیر بلا۔ ہر وقت اور ہر موقع پر نئی دہن ایک نہ ایک بات ایسی جڑ دیتی کہ احسان آگ بگولا ہو جاتا۔ اور منہ میں جاتا سٹنا جاتا۔

ایک روز شام کے وقت احسان نے اپنے چند دوستوں کی دعوت کی۔ زاہد نے ہنسنی ہنسی اور خوشی خوشی کھانا تیار کر دہن کے آگے لا کر رکھ دیا اور کونہ میں بیٹھ گئی۔

دہن۔ ”بس باورچی خانہ میں جاؤ پیر سے سر پر کیوں چڑھ کر بیٹھ گئیں۔“

زاہد۔ ”ہاں بیوی چلی جاتی ہوں۔ اس لئے بیٹھ گئی تھی کہ شاید بزن غمیر

کی ضرورت ہو تو دیدوں۔“

یوں تو دن رات ہی زانہوں کے دل پر ایک سے ایک زبردست چرکا لگتا تھا۔ مگر اس وقت کا کچھ کا ایسا بیٹھا کہ آنکھ میں آنسو آ گئے۔ دس بارہ آدمیوں کا کھانا ایک کبیلی پکانے والی۔ دوشنبے کی چوٹھے میں گھسی گھسی مغرب کے وقت نکلی۔ اور یہ انعام ملا۔ علیحدہ جا کر روئے لگی کہ احسان آیا اور کہا "کھانا باہر کون دے گا؟" وہ اس نے "لاؤں یہاں سے وہیوں کی تم وہاں سے لے لینا۔"

”ہیں وہیں۔“

وہیں۔ ”کیا بتاؤں وہ ہمیشہ نافرمان رہتی ہیں۔ میرا جو کام تھا۔ میں نے کر لیا۔ کیا خرچ ہے میں اُدھر سے دیدوں گی تم اُدھر سے لیلو۔“

”زائدہ - ”جی“ -

زاہدؑ نے احسان سے چھپانے کے واسطے دوپٹہ سے آنسو منہ پھیر کر
پونچھے اور کہا ”آپ جعفرؑ نہیں جانتے ہیں۔“

احسان - "کھانا اور کپڑے تو کھڑے ہو کر دے دو"

زادہ - "اچھا" -

نئی دہلی کے کھانا کھانا لانا۔ اٹھ اٹھ کر باہر دیا۔ مگر یہ معلوم کیا نہر
کھانے میں تھا کہ ایک ایک نوالہ کھا کر سب سے ہاتھ ٹھیک لیا۔ چاولوں میں ٹک و ہر سالن
میں مرچیں ملائی۔ اور تو اور غصہ یہ کہ فیرنی میں برابر کی خاک اور کھانوں میں برابر
کی راکھ۔ احمقانہ سے ہوشیاری سے رسم۔ دعوت، عداوت، اور ضیافت مصیبت ہوگی۔

بازار سے جو کچھ میسر ہوا لوان کے پیٹ بھر چلنا کیا۔ اور آپ آگ بجولا گھر میں آساری داستان دلہن کو سنائی۔

دلہن۔ ”میں تو اسی واسطے سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتی ہوں کہ اپنا کام مہا کام۔ ہاں ان گجراتی کنگنوں میں یہ مار ہے کہ مرچیں اندر بیٹھ جاتی ہیں۔ اس لئے مصالحہ ان سے پسو لیا تھا۔ کیا خبر تھی کہ یہ آفت ڈھائے گی۔ ورنہ میں تو ان کو باورچی خانہ میں قدم بھی نہ دھرنے دیتی۔“

احسان۔ ”یہ تو صورت دیکھ دیکھ کر علی جاتی ہے۔ شریف تھوڑی ہے جو شرافت کے برتاؤ کو سمجھے۔ میں اس کجبت کو غارت کر دیتا ہوں۔ اور اس کے منہ ہی کو آگ لگاتا ہوں۔“

بنصیب بیوی کی کیا مجال تھی کہ سفاک شوہر کے حکم میں دم مار سکتی جب تک جاگتا رہا صلواتیں سناتا رہا۔ کنبہ بھر کو اگلا۔ سات پشتوں کو پٹنا۔ جو جی میں آئی وہ سنائی۔ اور جو منہ میں آیا وہ بنایا۔ صبح اٹھا تو حکم دیا کہ آج تو غارت ہوگی اپنا اسباب و سبب باندھ لے۔

زاہد کا آہول کا پورا ذخیرہ شوہر کے پاس چھوڑ حسرتوں کا وزنی اسباب ساتھ لے پہاڑ سے چلی۔ گھر کو گھر کے کوڑ کوڑ کوڑ آخری نظر سے دیکھا۔ محلہ اور محلہ کا بچہ بچہ اس کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کر رہا تھا۔ رائیہیں اس کی بلایاں لیتی تھیں۔ اور یتیم اس کے قدموں میں لوثتے تھے۔ اس نے گاڑی میں بیٹھے وقت ایک التجا بھری نظر شوہر کی صورت پر ڈالی۔ اور کہا:-

”خدا کے واسطے میرے تصویر محاف کر دینا“

اگر ایمان پاس ہوتا، اگر عقل ساتھ دیتی تو مظلوم بیوی کی یہ التجا عالم کا کلیجہ توڑ دیتی۔ مگر دل سے نہیں دکھا دے کہ نہیں۔ فقط شوقی پورا کرنے کو ہاتھ بڑھا کر

مصافحہ کیا تو کیا دیکھتا ہے کہ بد نصیب بخار میں مجلس رہی ہے۔ پوچھا کیا حال ہو؟

زاہدہ - "خدا کا شکر ہے۔"

احسان - "روئے کا سبب؟"

زاہدہ - "کچھ نہیں۔ ایک بات عرض کرتی ہوں۔"

احسان - "کیا ہے؟"

زاہدہ - "تمہاری تنخواہوں میں سے کچھ روپے میرے پاس بچے ہیں

یہ لے لو خدا نصیب کرے۔"

دونوں روپے کی ایک پوٹلی زاہدہ نے شوہر کے ہاتھ میں سی اور رو کر کہا:-

میری خطائیں معاف کر دینا۔"

احسان - "اچھا۔"

زاہدہ - "خدا حافظ۔"

زاہدہ کی گاڑی شکل سے سو گز گئی ہوگی کہ احسان ہانپتا کانپتا دوڑا آیا۔

اور دُور سے گاڑی بان کو آواز دی کہ روکو۔ گاڑی رُک گئی۔ احسان کا چہرہ غصہ

سے سُرخ تھا۔ وہ برا بھلا کہتا ہوا اندر گھسنا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا اور کہا:-

"کبکنت چور! روپیہ دیکر شاہ بنی۔ اور سارا زیور اڑا لائی۔"

احسان کا غصہ اس قدر تیز تھا اور اس قدر چلدا رہا تھا کہ اسکی حالت دیکھ کر

لوگ سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ اسباب نکال نکال کر باہر پھینکنا شروع کیا۔ اور زبان سے

وہ الفاظ استعمال کئے جن کو سنکر خلقت بھی دنگ رہ گئی۔ زاہدہ بخار میں لوتھو میاں کی

صورت تک رہی تھی کہ احسان نے کہا "بتا کبکنت نامزد زیور کہاں چڑا کر رکھا؟"

زاہدہ - "مجھے معلوم نہیں میں تو دہن کے کمرے میں گھسی بھی نہیں۔"

احسان - "پکلی چور ہے کیوں قید نہ لے لگی! اس جس کی کٹھیاں دے۔"

بخار کا زور چوری کا الزام خلقت کا از وہام۔ بد نصیب کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ وقت کی بات ہے کنبیاں نہ ملیں۔ احسان کو تاپ کہاں تھی۔ اتنا کہہ کر کہہ ہاں چوری نکلتی ہے کنبیاں تو آپ ہی سے کھوئی جائیں گی۔ پتھر سے قفل توڑا زبور کی پوٹلی موجود تھی۔ نکال کر اس زور سے منہ پر ماری کہ چکر لگی۔ گاڑی کو ڈاکر گھر لے گیا۔ نئی دہن دروازہ میں کھڑی تھیں دیکھتے ہی گھبرا کر پوچھا "کیوں ملتا؟"

احسان۔ "ہاں کیوں نہ ملتا۔"

اسباب اُترا زاہدہ اندرائی۔ چوری کے غل غپاڑے سے محلہ کی عورتیں بھی جمع ہو گئیں۔ زاہدہ خاموش گم سم گھڑی تھی۔ اور کہتی تھی "زمین شق ہو جائے اور میں سما جاؤں کہ دہن لے گیا۔"

"خدا کا شکر ہے میں نے ابھی دیکھ لیا۔ ورنہ وہ نوہ میرے اوپر مقفول ہی

چلی تھیں۔"

احسان۔ "اری بول تو سہی جل جو گئی اچورا آنکھوں کا کاجل چورانے

والی کبھی تجھ سے زیادہ نہ ہوگی کمینت؟"

محلہ والیاں بھی جو منہ میں آتا کہتی رہیں۔ اور کوئی متذنب ایسا نہ تھا جو زاہدہ پر بدن طعن نہ کر رہا ہو۔ ایسا خاموش تصویر تھی ایک ساکت پتھر تھا، ایک گم سم عورت تھی جس کی آنکھ سے متواتر آنسو کی لڑیاں بہ رہی تھیں۔ نگاہ اٹھتی نہ تھی۔ بات ہوتی نہ تھی۔ انتہائے ندامت تھی کہ دن رات دعائیں دینے والیاں پکا چور کہہ رہی تھیں۔ دہن بولی "تو میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں۔ خدا معلوم کس وقت نکال کر رکھا۔ وہ تو خدا نے خیر کی کہ تم نے روپے مانگے۔ میں صندوق کھولنے لگی۔ دیکھتی ہوں تو پوٹلی نڈا۔ غضب خدا کا گھر میں یہ آفت کہو وہ کس کا تھا۔ کس کی تو ایک ہی کی ہے۔ لہذا اہل کس کا اور میرا کس کا؟"

نئی دُہن کو شش میں تو غصہ سے نئی کہ کسی طرح ایسا ذلیل اور ایسا رسوا کروں کہ احسان اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا کیسا اس کا نام تک نہ لے۔ مگر موقع کا انتظار تھا۔ اب جو زاہدؔ نے اسباب باندھنا شروع کیا تو پچھلے سے جس میں زیور رکھ۔ خاموش آبیسی۔ اور جب گاڑی روانہ ہو گئی تو میاں سے کہا کہ ”زیور رکھ لگائیں“ چوری پوری اور مال سامنے تھا۔ اس وقت تک احسان کی بدولت جس قدر مصیبتیں آئیں زاہدؔ نے ان کو راحت سمجھا۔ سو کن کے کانٹے پھول کی طرح گود میں لئے اور ناگ سے کھلونے کی طرح کھیلی۔ مگر اس صدمہ نے جان پر بنا دی۔ عورتیں صحن میں کچا کچھ بھری تھیں۔ نئی دُہن نے ستم یہ کیا کہ اسی وقت اپنے رشتہ داروں کو بھی تہا شا دیکھنے کے لئے بلا لیا۔ ہر طرف سے لعنت، اور ہر کونہ سے ملامت کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ شام کے وقت احسان نے برابر میں ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا۔ زاہدؔ کو بھیجنے کی تجویز کی اور کہا ”تجھ چور مکار کی سزا تو یہ تھی کہ عمر بھر جیل خانہ میں سڑ سڑ کر مری مگر تم شریف ہیں کہ اپنی شرافت سے کام لے کر تجھ پر رحم کرتے ہیں۔“

ابا البتہ ایک جوش زاہدؔ کے سینہ میں اُٹھا۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ اس کی آواز غصہ سے بھر ا گئی۔ اس نے سو کن کی طرف دیکھا اور کہا ”انسانے آنکھ سے پوشیدہ رہنے والا ہر معاملہ قدرت کی اس زبردست آنکھ کے سامنے ہے جو پہاڑ کی ڈراڑ میں چوٹی کے رینگنے کی اور کھوکھلے تنے میں کیرے کی حرکت کو دیکھتی ہو۔ شہادت صرف چشم ظاہری پر ختم نہیں۔ جن مظلوموں کا کوئی نہیں ان کی بے گناہی کا گواہ صرف وہ قدرت والا ہے۔ جو اس فانی جہم کو ایک روز خاک کر دے گا اور جانتا ہے کس نے زیور کی پوٹی اس جس میں کھی۔ میں نے اگر اس پر دیں میں اپنے خاندان کی آبرو اور اپنے باپ دادا کی لاج پر چوری کا التزام نہ کرنا۔ نہ دل کو باندھنا اور مردوں کو اذیت دینی تو اس کا بہتر فیصلہ کرنے والا وہی حکم الٰہی ہے۔ دنیا کی کسی حالت کو تباہ و زندقہ کی

کسی کیفیت کو قیام نہیں۔ اطمینان غرضی اور خوشی چند روزہ ہماں ہے جس طرح موت زندگی کی تاک لگائے بیٹھی ہے۔ اسی طرح بے اطمینانی اطمینان کے شکار ہیں مصروف ہے اولین یگم جس وقت نے مجھ سے وفانہ کی یہ غم سے بھی نہ کریگا۔ پالسانی ہستی جو شدہر کی حیثیت میں میرے سامنے کھڑی ہو۔ اسکی بدولت بیٹے بھی اس دنیا میں راج کئے۔ مگر آج جب میرا تخت چھن گیا۔ اور میں سلطنت کھو کر تہاری دست نگر ہو تو صرف یہ خیال مجھے تقویت دے رہا ہے کہ سہاگ کے زعم میں نا اتفاقی کی آگ کو فزائش نہ کیا۔ کوئی بات ایسی نہ کہی اور کوئی کام ایسا نہ کیا جو دوسروں کے واسطے کلفت اور اذیت ہو۔ میں نے تمہارے ساتھ اگر آج تک کوئی بُرائی کی ہو، کوئی ایذا پہنچائی ہو تو تم مجھے بتا دو۔ میں نے کدوے گھونٹ شہد کی طرح پئے اور زہر کا پیالہ امرت سمجھا۔ اس سزا کی سزا دار نہ تھی کہ میری عزت اس بھرے صبح میں اس طرح برباد ہو۔ اور میری چور کی غلط ڈھنڈورہ پردیس کی سڑکوں پر پئے۔ خیر خدا کی مرضی اور شہر کی رائے سزا کھول پر۔ جو ہو گیا خوب ہوا، اور جو ہو گا اچھا ہو گا۔ لیکن وقت آئیگا کہ شاہ جعفری کی صدا واقعات سے تاریکی کا پردہ اٹھا دے گی۔ اور دُنیا دیکھے گی کہ زراہن بے گناہ تھی۔

بچکی بندھی ہوئی تھی، اور وہی درود یار جو حسرت برسا رہے تھے زراہن کی عداقت کا نعرہ لگانے لگے۔ احسان خاموش اور دہن ششدر تھی کہ زراہن آگے بڑھی اور شہر سے کہا چلو جس جگہ پہنچا ہے پہنچا دو۔ مؤذن اذان لے رہا ہوتا قضا ہو۔ ایک ایسی رفتار سے جس میں سرتاپا ندامت شامل تھی احسان چلا۔ اور زراہن کو دوسرے گھر میں لے جا کر بٹھا دیا۔

ستر ہواں باب

”وقت نے تم کو اتنا بڑا جھکو لادیا اور وہ معیبت ڈالی کہ اگر پتھر بھی ہوتا تو موم بن کر خدا

کے حضور میں گر پڑتا۔ اور مان لیتا کہ قدامت کے کیسے کیسے جو ہر تم نے خاک میں ملا دئے!

جن کو غم جاہل اور بھوہڑ کہہ رہی ہو وہ درحقیقت ایسی شخصیں کہ فرشتے ان کے دامن پر نماز پڑھتے۔ مگر افسوس تمہاری عقل پر اور تعجب تمہارے قیاس پر کہ اپنی آبرو گنوا کر بھی تمہاری عقل درست نہ ہوئی۔

شاہدہ۔ ”آپ ہر وقت مجھ کو اسی ایک بات کا طعنہ نہ دیا کیجئے۔ اس کو اسے کیا واسطہ۔ میں جو بات کہہ رہی ہوں اس کا جواب دیجئے۔ یہ جو آئے دن کج بحث فقیر ہٹے کٹے مولے ترازے گل بھلاتے رہتے ہیں کہیں کوئی صوفی بن کر زبور سے اڑے، کہیں کوئی تحن بن کر گھر موس لے گئیں یہ سب قدامت کے کرشمے تھیں تو کیا ہیں؟ آپ ہی کا بیان ہے بارہا آپ نے کہا آپ کی والدہ صاحبہ سے فرمایا کہ آپ کی چچی جان کو ایک بڑھیا نے پیرانی بن کر ایسا دبوچا، اور اتنا صفایا کیا کہ دانتا کر بیرنے کا ترکا تک نہ رہا۔ اگر وہ پڑھی لکھی ہوتیں، ان بدعاشوں کے واقعات ان کے کانوں سے کبھی چکے ہوتے، ان کٹھنوں کی چالاکیاں وہ اخباروں اور کتابوں میں پڑھ چکی ہوتیں، تو کیوں اس کے چمکے میں آتیں؟ شوہر کے گارڈھے پیسے کی کمائی بچوں کا محنت سے پیدا ہوا پیسہ اس طرح برباد نہ ہوتا۔ اماں جان آپ نے ان کی حالت پر تو ہمیشہ افسوس کیا مگر یہ بھی خیال فرمایا کہ آپ کے چچا جان پر کیا گزری ہوگی۔ جن کی چیخ جھٹھا ایک جاہل عورت کی بدولت گنتی کی نذر ہو گئی۔“

مال۔ ”تم ایک بات کو دوسری بات میں نہ ملایا کرو۔ میں نے ہمیشہ تمہارے سامنے اقرار کیا ہے کہ اگلی بیویاں باوجود ان تمام خوبیوں کے بخوان کا حصہ تھیں۔ اس قدر بھولی ہوتی تھیں کہ کسی کو جھوٹا سمجھنے کا وہ ہم بھی ان کے دل میں نہ آتا تھا اور اگر تم غور کرو تو ان کی یہ تربیت کچھ غلط نہ تھی۔ اسلام کی تعلیم ہے کہ کسی مسلمان کی طرف سے

بظن نہ ہو۔۔۔ اب اس کا ذمہ وار وقت ہے کہ کیوں ہم میں ایسے مسلمان پیدا ہونے شروع ہوئے جو اسلام سے ہزاروں کیس دُور رہے۔ اور روحانیت کو کھو کر نفسانیت میں غرق ہو گئے۔ تمہاری تعلیم کھرے اور کھوٹے کی تیز بتاتی ہے۔ اور میں اس کو ضروری سمجھتی ہوں لیکن ان کے یہاں کھوٹ کا وجود ہی نہ تھا اس لئے ان کو اس شناخت کی بھی ضرورت نہ تھی۔۔۔ اب البتہ اس تعلیم کی ضرورت ہے اور اگر بُرا نہ مانو تو اس کی ذمہ دار بھی ترقی ہے۔ اگر نامہ اس قسم کی ترقی نہ کرتا تو ہم بھی وہی سیدھے مسلمان ہوتے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ گنڈے تعویذوں کی طرف ان کا عقیدہ پختہ تھا اور گو میں خود ان ڈھکوسلے باز پیروں کی قایل نہیں ہوں۔ مگر یہ ضرور کہوں گی کہ وہاں کے اثر کی میں قایل ہوں۔ اور اس کا فیصلہ تم خود اس طرح کرو کہ اگر تم کو کوئی معمولی بات تمہارے مزاج کے خلاف کہہ دیتا ہے تو آگ لگ جاتی ہے۔ اور اگر کوئی عاجزی سے گزر گا اگر کچھ عرض کرے تو خواہ مخواہ طبیعت میں رحم پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح بندہ جب خدا کے حضور میں سچے دل سے رو کر کچھ مانگتا ہے۔ تو وہ سُنتا ہے اور ضرور سُنتا ہے۔ اسی سلسلے میں ان بزرگانِ دین کی دُعا شامل ہے۔ جو خدا کے پاک بندے سچے مسلمان اور نیک انسان ہیں یہ وجہ ہے کہ چچی جان گنڈے تعویذوں کی طرف جھکی ہوئی نہیں۔۔۔ ایسا بھی اگر کوئی ولی کامل نظر آجائے جس کا نظر آنا حال، تو سب سے پہلی عورتِ فزان کے ہاتھ پر سجدہ کرے میں ہوں۔ لیکن یہ موجودہ گنڈے اور تعویذ جن کی غرض صرف دھوکا ہے۔۔۔ فخارت سے رد کر نیوالی بھی میں ہی ہوں۔ تم نے ان کی اس غلطی کو تو پکڑ لیا۔ جو غلطی نہیں بلکہ تلاشِ حق تھی۔ اور ان کی نیت یقیناً قابلِ الزام نہیں مگر ان کی بھلائیوں پر بھی تو کبھی نظر ڈالی ہوتی۔ وہ وہ گریں کہ سچ تم اور میں مگر کبھی وہ جیسے یہاں نہ کر سکیں گی۔ دوپہر کا سنسان وقت تھا اگر مری دُور شہر سے پڑھی تھی تمہارے تار کے واسطے لوٹا بھر دھوکے لئے آ رہی تھیں کہ یہ خدا کاں میں آئی۔

”ایک خدا کے وہ بندے ہیں جو قیدیوں کو آزاد کرتے ہیں۔ ایک تم ہو کہ مسلمان کو جیل خانے پہنچاتے ہو۔“

لوٹنا چھوڑ کوٹھے پر گئیں، جا کر دیکھتی ہیں تو آدمیوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگا ہوا۔ ایک ضعیف العمر انسان کو جس کی ڈاڑھی سفید بجلی کا پُر، عدالت کے اہلکار گرفتار کیے کھڑے ہیں۔ اور ایک نوعمر انسان آنکھیں نکال نکال کر برا بھلا کہہ رہا ہے بڑھا خاموش تھا۔ اس کے لب پر آہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ قلم قلم کر ٹھٹے سانس لیتا تھا اور آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔ مجمع میں سے ایک شخص نے جوان آدمی سے پھر وہی الفاظ دہرا کر کہا۔ ”یہ شخص جو آج تمہارا مقروض ہے۔ اس سے زیادہ بد نصیب آدمی دنیا میں مشکل سے ہوگا۔ اس کے سیاہ بال خلق اللہ کی خدمت میں سفید ہوئے اس نے سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے یتیموں اور یراندازوں کو دئے۔ محتاج اس کے در سے سائل اس کے گھر سے خالی نہ گیا۔ آج سے تین سال پہلے اسکی دولت کا ڈنکا تمام شہر میں بج رہا تھا۔ خدا کسی کو نہ بگاڑے۔ تم پر اس کے احسانات ہیں تم نے اس کا نمک کھایا۔ اس نے یتیم خانہ سے نمک لکر تمہاری پرورش کی۔ اپنے روپے سے تم کو اس قابل کیا کہ آج تم کا روبرو کر رہے ہو۔ کیا اسی دن کو کہ جب اس کا کاروبار بگڑ جائے۔ یہ برابر کے جوان بیٹے کا جنازہ کندھے پر ڈھوئے۔ اور عمر بھر کی رفیق بیوی کو گہری گود میں سلا کر مسجد کے ایک کونے میں بیٹھ خدا کی عبادت میں مصروف ہو تو تم جھوٹے دعویٰ سے روپے کا مطالبہ کرو۔ اور اس کو گرفتار کر لو۔“

ضعیف العمر کی سفید ڈاڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ وہ آسمان کی طرف دیکھتا تھا اور نگاہ نیچی کر لیتا تھا۔ اس نے کچھ سوچا اور نوعمر کی طرف دیکھ کر کہا :-

”میں ماسک پیٹ سے کچھ لیکر نہ آیا تھا۔ جو کچھ پیدا کیا اسی دنیا میں اور جو کچھ ختم کیا وہ ہم اسی دنیا میں جس طرح خالی ہاتھ مارے گئے پیٹ سے آیا اسی طرح خالی ہاتھ

قبریں چلا جاؤں گا۔ روپیہ میرے پاس بھی نہ رہا۔ اور تمہارے پاس بھی نہ رہے گا۔ مگر اس کا اثر اس کا نتیجہ اور اس کا طفیل میرے پاس ہے۔ اور تمہارے پاس ہونے والا ہے۔ دنیا تماشاکاہ ہے۔ یہاں نت نئے تماشے اور رنگ برنگ کے کھیل انسانی زندگی دکھا رہی ہے۔ جو ہر لمحہ اس وقت قیدی کی حیثیت سے دوسرے ہاتھ میں ہو۔ اس میں روپے کی ریل پیل تھی۔ اثرفیوں کا ڈھیر تھا۔ اور دولت کی بچھاڑ تھی۔ ہم یہ سب سوانگ دیکھ چکے۔ اور اب مجبوراً چارہیں میرے پاس اب کچھ نہیں۔ میری تمام کائنات ساری ملکیت، کل اثاثہ، ایک بدہستی، ایک تنہا، اور ایک جانناز ہے۔ یہ اگر تمہارے کام آسکے تو شوق سے لو۔ خدا کی دنیا وسیع ہے۔ دریا کا کنارہ میری بدہستی۔ ہاتھ کی انگلیاں میری تسبیح، اور خنجر کی گھانس میری جانناز ہوگی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے تم سے یا کسی سے کبھی فرض لیا ہو۔ میں نے اس پیٹ میں بیانیہ بٹی کھائیں۔ اور اب سوکھی روٹیاں بھی کھانا ہوں۔ مگر میں نے جب تمہارا کام بگڑا میری بات گئی، آج تک کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلا یا۔ یہ ہاتھ جو اس وقت قید ہے اس کو خیر ہے۔ کہ سوا اس خدا کے جس کے سامنے پانچ وقت اٹھتا ہے کسی کے آگے دراز نہ ہوا۔ میں نوازی پٹنگوں پر سو یا۔ اور آج بان کی چار پائی مجھ کو میسر نہیں جس خانوں میں رہا۔ اور اب ٹوٹی جھونپڑی بھی میری ملکیت نہیں۔ میں ایک جوان بیٹے کا باپ اور ایک مسلمان عورت کا شوہر رہا۔ مگر اب نہیں ہوں۔ میری آنکھوں نے عیش کے جلسے دیکھے، اطمینان کی گھڑیاں دیکھیں، اور انہیں آنکھوں نے بیٹے کا مردہ دیکھا۔ بیوی کی لاش دیکھی لیکن خدا کی مرضی پر راضی اور اس کے حکم پر خوش ہوں۔ جس طرح فرحت میں مشاکر رہا۔ اسی طرح مصیبت میں صابر ہوں۔ مجھ کو تمہارے دعوے کی خبر تمہارے مطالبہ کا علم۔ تم نے اصرار کیا کہ دعوت میں ضرور یک ہو۔ میں انکار کرتا۔ مگر اس لئے کہ تمہاری دل شکنی نہ ہو۔ حاضر ہو گیا۔ تم نے میرے ساتھ دھوکہ دیکر یہ داؤں کھیلے

مجھے جیل خانہ بھی غنیمت ہو گا۔ اور میں جس خدا کو یہاں یا دگر رہا ہوں، وہاں بھی فراموش نہ کروں گا۔ مگر بزرگ ہوں۔ نصیحت کرتا ہوں۔ سنو اور یاد رکھو دنیا فانی ہے یہ عمر ہمیشہ اور یہ وقت سدا رہنے والا نہیں۔ کام وہ کرو کہ نام نیک ہو۔ اور جب یہ عمر ڈھل جائے، اور یہ رنگ بگڑ جائے تو پچھتا نا نہ پڑے۔

میں غفلت ہوں میرے پاس روپیہ پیسہ کچھ نہیں۔ جوڑے کے سوا جو بدن پر ہے اور دوسرا دھو بی کے یہاں میرے پاس کپڑا بھی نہیں چلو، لے چلو جہاں لے چلنا ہے اور پہنچا دو جس جگہ چاہتے ہو۔ ڈیڑھ سو روپے دے کر مجھے چھڑانے والے قروں میں آرام کر رہے ہیں۔ چلو بسم اللہ کرو۔

خلقت کی آنکھ سے آنسو جاری تھے کہ چچی جان نیچے آئیں۔ انہوں نے ڈیڑھ سو روپے نکالے اور چچا جان سے تمام واقعہ بیان کیا۔ چچا جان کے کلیجے پر بھی چوٹ لگی۔ وہ روپے لے کر باہر آئے۔ اور انہوں نے وہ روپیہ پیش کیا اور کہا:-

”میری بیوی کی طرف سے جو کوٹھے پر آپ کی تقریر سن رہی تھی یہ ناچیز رقم قبول فرمائیے۔ اور قرض میں ادا کر دیجئے۔“

ضعیف العمر کی آنکھ اب خشک ہو چکی تھی۔ انہوں نے روپے کے لینے سے انکار کیا اور کہا:-

”میں مرد ہوں مجھے یہ حق حاصل نہیں کہ اپنی تکلیف کا بار ایک عورت پر ڈالوں۔“ مگر جب چچا جان نے زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے روپیہ لے کر اس جوان کو دے دیا اور ایک پیچ مار کر یہ کہتے ہوئے گر پڑے:-

”جس دنیا میں سبے گناہوں کو قید کر دینے والے مرد موجود ہیں ہاں روپیہ دیکر آزاد کر دینے والی مسلمان عورت خدا تجھ کو دین و دنیا میں خوش رکھے۔“

بات گئی گذری ہوئی، معاملہ ختم ہو گیا۔ جو واقعہ چچی جان دکھا گئیں اب تک زندہ ہے۔ اور گودہ لوگ نہ رہے۔ مگر دیکھنے والے ابھی تک موجود ہیں۔ اور سُننے والے عرصہ تک موجود رہیں گے۔

تم نے ان کی ایک بات تو رٹ لی۔ جس میں ان کی نیت بخر تھی اور وہ بھی اُنہوں نے کسی لالچ یا توقع پر نہیں قرضِ حسنہ دیا تھا۔ لیکن اس واقعہ کا خیال نہ رکھا۔ جو ان کے دامنِ حیات پر سدا بہار پھول کی طرح کھل رہا ہے۔

اٹھارواں باب

احسان۔ ”یہ آخر کیا مصیبت ہے جو آج پانچ روز سے ڈاک بٹھا رکھی ہے۔ صبح ہے تو شام ہے تو آخر ایسا کیا ضروری کام ہے کہ گھر میں بیٹھنے کا حکم ہی نہیں۔ کہو کیا کام ہے؟ کیوں بل رہی ہو؟“

زہرہ۔ ”اگر فرصت ہو تو تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ۔ مجھے ایک ضروری بات دریافت کرنی ہے۔“

احسان۔ ”مجھے مطلق فرصت نہیں ہو۔ دامنِ پیگم آج تاشہ میں جائیں گی۔ گاڑی کا انتظام کرنا ہے۔ میں کھڑے ہی کھڑے تمہاری بات سُن لوں گا۔ کہو کیا کہتی ہو؟“

زہرہ۔ ”پرسوں عشرہ ہے کچھ نذر تیار کرو گے؟“

احسان۔ ”مرٹ اسی واسطے بلایا تھا۔ افسوس۔“

زہرہ۔ ”اے بلانے کی غرض تو یہ ہی تھی۔ افسوس کس بات کا؟“

احسان۔ ”اس لغویت اور جہالت نے غم کو یہ دن دکھایا۔ اور ابھی تک یہ حرکتیں ختم نہ ہوئیں۔“

زہرہ۔ ”اس میں لغویت اور جہالت کی کیا بات ہے؟ میں دریافت کرنا

چاہتی ہوں۔“

احسان۔ ”اس سے زیادہ غریب اور کیا ہوگی! ایسی فضول رقم کس کے پاس دھری ہے کہ حاصل دین نہ دُنیا، تمہاری اماں کی طرح دوسنِ علیم رات بھر گھوٹے اور سن بھر کی کھیر پکائے۔“

نارادہ۔ ”میں تو صرف دریافت کرتی ہوں۔ اس میں ناخوش ہونے کی کیا بات ہے؟ ان کا فعل ان کے واسطے تمہارا تمہارے واسطے۔“

احسان۔ ”خیر تمہارے رائے کیا ہے؟ محرم میں کیا ہونا چاہیے۔ کیا کوئی تعزیر میں بھی نکالوں؟“

نارادہ۔ ”نہیں یہ مطلب تو میرا نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ پیہ دھیلارو بھی سُکھی، جو اللہ نے دی ہو۔ شہیدوں کے نام کی نذر نیا زہ جائے۔“

احسان۔ ”تمہاری آنکھوں پر جہالت کے ایسے پردے پڑے کہ کسی طرح اٹھ نہیں سکتے۔ آخر تم ہی جیسی عورت دہن پیچیں۔ مگر کیا تعلیم نے خیالات میں ایسی شستگی پیدا کر دی ہے کہ گھر اور زندگی دونوں جنت بنے ہوئے ہیں۔ تمہارے ہی عقیدے کے موافق امام حسین علیہ السلام جو رسول اللہ کے واسطے تھے۔

جنت میں پہنچ گئے۔ اور تمہارا یقین ہے کہ سرفراہیں جو انان بہشت کے۔ انکی والدہ تمہاری رائے میں خاتونِ جنت ہیں۔ اب تم ہی بتا دو کہ کیا وہ لوگ تمہاری اس فضول نیاز کے محتاج ہیں۔ او۔ اس کا نتیجہ سوا اس کے کہ تم چند الفتنوں کو کھالے کھلا دو اور

کیا ہو سکتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ان لطوایات میں کیا مصلحت ہے۔ اس کی اصلی غرض صرف یہ ہے کہ مسجد کے ملالے جنہوں نے یہ ڈھکوسلے نکالے اس بہانہ سے ترمال اڑائیں۔ اور نذر نیاز کے مال ان کی خدمتوں میں پہنچیں۔ ایسا مفت کاروبار میرے پاس افسوس نہیں ہے۔ ہاں تمہارے والدین کے پاس ہو۔ تمہاری ماں جو کچھ کریں رست ہو۔“

زادہ۔ ”تم بھی کیسے مزے کی باتیں کرتے ہو کیا محبت کا اظہار صرف حاجت مند کے ساتھ ہوتا ہے۔ خوشحال کے ساتھ نہیں ہو سکتا؟ غریب پر در آدمی اس کی حاجت رفع کر کے احسان کرتا ہے اور امیر کی محبت ناچیز تندر سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ ہاں دوسرے کیا پانی کے گھرے کی جواہری لیکر آیا تھا وقت نہ کی۔ نیت دینے والے کی دیکھو چاہیے لینے والے کی حیثیت نہیں۔ یوں تو خدا اور رسول کے نام کی بھی نیل ہوتی ہے تو کیا خدا اور رسول ہمارے بھوکے ہیں۔ ہم خدا کے نام پر ایک اپنا بچ کو پیسہ دیتے ہیں تو کیا ہمارا یقین یہ ہے کہ نعوذ باللہ خدا ہمارے ایک پیسہ کا محتاج ہے اس کی لاتعداد دولت اس کے بیشمار خزانوں اس کی لازوال سلطنت میں ایک پیسہ کوئی ہستی نہیں رکھتا۔ لیکن خلوص سے دیا اور دل سے پیش کیا جائے تو وہی ایک پیسہ بڑا پار کر سکتا ہے۔ حضرت امیر حسین علیہ السلام بے یار و مددگار میدان کریم میں شہید ہو کر استقلال کا سچا نمونہ اور اسلام کی بے نظیر مثال دکھا گئے۔ وہ حضور اکرم کے نواسے، خاتونِ جنت کے تحت جگر ہیں۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا کام ہے کہ اس ائمہ کو زندہ رکھیں اور انہی والی نسلوں کے دل سے اس سانچے کو فراموش نہ ہونے دیں اس یاد کو تازہ رکھنے کی صورت سب سے بہتر یہی ہے کہ ہم اس روزان پاک روحوں کے کارنامے خود پیش اور دوسروں کو سنائیں۔ اس کے ساتھ ہی جو کچھ خدا نے ہم کو دیا ہے وہ ان شہیدوں کے واسطے جہنم لے صداقت پر اپنی جانیں قربان کیں۔ خرچ کریں اور خدا سے انجا کریں کہ وہ پاک بندے جن پر تو اپنی رحمت نازل کر رہا ہے۔ ہم ہماری تندر کے محتاج نہیں ہمارا یہ خیر ہر یہ ان کی خدمت میں پہنچا دے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم خودیں گے وہی ان کو پہنچے گا۔ وہ ان دنیا کے مکروہات کا کیا کریں گے۔ جہنم سے دنیا میں انکی پرواہ نہ کی۔ وہ آخرت میں اس سے مستغنی ہیں۔ مگر ہمارا یہ فعل ان کی ہمت و صداقت کا اعتراف ہے۔ اور سب سے بڑا راز جو اس آئیں ہے وہ صرف اس قدر کہ اس طرح

ہم ان غریبوں کے ساتھ سلوک کر سکیں۔ جن کا کوئی والی وارث نہیں۔ اور جو دو دو دانوں کو محتاج ہیں۔ میں اس مسجد کی خدمت جس کی اذان کاں میں آئے فرض سمجھتی ہوں۔ لیکن ہرگز ہرگز ان موٹے ٹنگروں کو دینا تو اب نہیں سمجھتی جو دھڑلے سے بھیک مانگتے ہیں۔ اور غصے کرتے ہیں۔ پر وہ نشین رانڈیں ہیں، یتیم بچے ہیں، مسکین طالب علم ہیں، محتاج بائچ ہیں۔ میرے خیال میں اس گروہ کا ہم پر ضرور حق ہے۔ اور ہمارا فرض ہے کہ ہم کسی طرح زکوٰۃ سے، خیرات سے، صدقات سے، ان حاجت مندوں کی اعانت کریں۔ نذر نیاز سے غرض بھی ان ہی حاجت مندوں کی اعانت ہے۔ اور اس لئے میں نے تم کو تکلیف بھی دی۔“

احسان۔ ”یہ فضول باتیں ایسی ضروری نہ تھیں کہ مجھ کو اس طرح تکلیف دی جاتی۔ آئندہ احتیاط کرنا۔ اب میں جاتا ہوں۔“

انیسواں باب

”جب تک اماں جان زندہ رہیں۔ میں نے اس وقت تک آپ کو ان سے کم نہ سمجھا، اور آپ کی رائے اور قیاس کی ہمیشہ وقعت کی اور اب کہ اماں جان جنت سرہا رہیں میری ماں آپ ہی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کہنے کو نہیں اتنی آپ میری ماں ہیں۔ اس وقت کوئی بڑا بوڑھا ایسا نہیں جو ہم کو نشیب و فراز سمجھائے۔ بیوی صاحبہ ہیں، وہ نور علی نور ہیں کچھ ہو چکا۔ مگر وہ صاحبیت اب تک ختم نہ ہوئی۔ اماں جان بھی اللہ بخشے اس کی ہمیشہ نشا کی رہیں۔ میری غلطی تھی کہ ابتداء میں آپ کی رائے کو مناسب نہ سمجھا۔ اس کا نتیجہ بھگت لیا۔ اب آپ اس وقت تشریف لے چلے اور خود چلی کر جو مناسب سمجھتے وہ کہجئے۔“

ساس۔ ”میاں یہ تمہاری سعادقت مندی ہے۔ اور میں ہر طرح سے

تمہاری تجویز سے متفق ہوں۔ میں توکل بھی اسی واسطے وقت پر پہنچ گئی تھی کہ تم نا تجربہ کار ہو۔ کسی بات میں کسر نہ رہ جائے اللہ کا شکر ہے جو اصلی کام تھا وہ اللہ نے پورا کر دیا۔ اب جو کچھ ہے وہ دنیا کے جھگڑے اور ہوت کی جوت ہے۔ پھولوں کی بکشت کل بھی میں سن آئی۔ تمہارے والد صاحب قبلہ اور تمہاری بیوی کا خیال تھا کہ پھول نفلوں ہیں۔ تمہاری پھوپھی اور خالہ دونوں بیویوں کی رائے تھی کہ ہوں اور ضرور ہوں۔ مجھ سے کسی نے صلاح نہ لی۔ نہ میں نے خود غل میںنا سب سمجھا۔ حسن۔ ”جی ہاں تو ان ہی باتوں کے طے کرنے کے واسطے تو آپ کی ضرورت ہے۔ اور تمام فیصلہ آپ کی رائے پر منحصر ہے۔“

حسن، ساس کو لے کر گھر کیا تو عورتیں بھری تھیں۔ اور مختلف بیویوں کی مختلف رائے تھی۔ کوئی کہنا تھا پھول ہوں۔ کسی کی رائے تھی نہ ہوں۔ بالآخر حسن کے والد دروازہ پر آکر سماعت سے کہا کہ پھولوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے اور اس رسم کا مردہ سے کیا تعلق ہے؟

سماعت حسن۔ ”یہ اس رسم کا مردہ سے کوئی تعلق نہیں سمجھتی۔ اور یہ وہ رسمیں ہیں جنہوں نے مسلمانوں کو تاراج و برباد کر دیا۔ اور ساس کا تمام ہارن مسلمانوں کی گردن پر ہے جنہوں نے مذہب کی آڑ میں اپنے پیٹ بھرے اور نفس کے کارن دوسروں کی تباہی کو جائز سمجھا۔ جس دھڑلے سے جس دریا دلی سے اور جس اطمینان سے یہ رسم ادا کی جاتی ہے۔ اس کو دیکھ کر رونا آتا ہے۔ اور جس شوق سے جس رغبت سے اور جس محبت سے اڑانے والے ان کھانوں کو اڑاتے ہیں۔ وہ کچھ تعجب انگیز نہیں۔ افسوس اس کا ہے کہ وہ مسلمان جن کا کام خلوص و ہمدردی تھا۔ صداقت سے لٹنے دور ہو گئے کہ دوسرے گھروں کی آگ سے انہوں نے ہاتھ تانے جانے سمجھے۔ مائیں جوان بیٹیوں کے لئے اور اولاد بابا پدوں کے لئے سرکراہیں مگر یہ سنگدل بریائی تنجن

اڈا کر تو نمدوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر ڈکاریں لیں۔ اس رسم کی غرض صرف اتنی تھی کہ زندے مرنے کو فراموش نہ کریں۔ اور چونکہ صدمہ تازہ ہے۔ لگی میں روپیہ عزیز نہ کریں خدا کی اس مخلوق کے کام آئیں جو اپنی زندگی فاقوں میں بسر کر رہی ہے۔ اور یہ یقین کر لیں کہ جس طرح وہ محتاج بندگان خدا کے پیٹ بھر رہے ہیں۔ اسی طرح خدا ان کے عزیز پرچم کر لگا۔ جو آپ صرف خدا ہی کی اعانت کا محتاج ہے۔ یہ محتاج واپانچ ویکس جو واقعی حاجتمند ہیں وہ ہونگے جن کو سوکھی روٹیاں بھی بریانی سے زیادہ اور مزہ و عطر سے بڑھ کر ہیں نہ کہ جو گھی میں تلنی اور گوشت میں خرابی کا امتیاز کریں۔

ایسے لوگوں کو کھانا کھانا اس قدر فضول اس قدر خلوت اور اس قدر زبردست غلطی ہے کہ خدا ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ اسی طرح مسلمانوں کا جمع کرنا بھی کچھ کم نادانی نہیں۔ شائبہ ہے ان بلانے والوں پر۔ اور صد آفریں ان آئے جانے والوں پر۔ جس قوم کی اخلاقی حالت اس قدر کمزور اور ایسی قابل ملامت ہو جائے اس میں جو کچھ بھی ہو وہ خلاف توقع نہیں۔ جو عورتیں اس ماسے جس کا ڈیل شیر پھر کر دیا اٹھو۔ میں اندھیر کر گیا۔ یہ توقع رکھتی ہیں کہ کھانے پینے کی مارات میں کمی نہ کرے۔ ساگران کے مرنے جو چوری دغا اور فریب کرتے ہیں تو تعجب کی کیا بات ہے؟ ضرورت تو صرف اتنی تھی کہ ایک گھر میں موت ہوئی۔ صاحب خانہ کے عزیز افراط اپنا کھانا لیکر اس کے پاس آئے۔ خود بھی کھایا اس کو بھی کھلایا۔ اس کا دل پہلایا اور اس کے صدمہ کو زائل کرنے کی کوشش کریں کہ یہ رسم توڑیں جو مسلمان آج کل اس رسم کی بدولت توڑتے ہیں۔

لیکن میری بحث کا نتیجہ یہ نہیں ہے کہ پھولوں کی رسم قطعاً اڑا دی جائے۔ بلکہ اس کو تسلیم کرتی ہوں کہ مذہب سے اس کا واسطہ کچھ نہ ہو۔ لیکن یہ ہمارے وہ بڑے بڑے بھائیوں کے مشائے سے ہم خود اگر نہ مشیں گے تو شے سے بدتر ہو جائیں گے۔ ہم زندہ رہیں گے مگر اسلام ہم میں نہ ہوگا۔ میرا کہنا بظاہر تعجب انگیز ہے اور میں خود

اس رسم کی حمایت کر رہی ہوں جو ہماری برابری کا پیش خیمہ ہے لیکن اسلام کے احکام ثابت کر رہے ہیں کہ ان کا نشانہ زیادہ نزیہ ہے کہ مسلمان باہمی محبت و اخوت نے زندگی بسر کریں۔ دولت مند اپنی دولت میں مست ہو کر ہا جنمندان کی تکلیف سے بے خبر نہ ہو جائیں۔ یہی غرض زکوٰۃ اور خیرات کی ہو کہ امیروں کی کمائی سے غریبوں کو بھی حصہ ملے۔ پھولوں کی رسم کا حاصل بھی رکھنے والوں نے یہ ہی رکھا ہے اور یہ ہمارا یقین ہے کہ خدا کسی کی محنت راہیگاں نہیں کرتا۔ جب ہم بلبلا کر اور گرگڑا کر اس سے التجا کریں گے تو وہ ہماری دعا سنے گا۔ اور جو کچھ ہم اس کی راہ میں دیں گے قبول کرے گا۔ اور دینے والے پر جو اپنے اعمال و افعال کی جزا و سزا میں مصروف ہے رحم فرما کر اسے عذاب سے رہائی دیگا۔ مگر کیا میں یہ کہتی ہوں کہ پھولوں کی رسم جس طرح ادا کی جا رہی ہے اسی طرح ادا کی جائے؟ تو یہ تو یہ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ فرض لے کر پھول کرنے اور حیثیت سے بڑھ کر کھانا پکوانا گناہ است گناہ۔ میری غرض صرف اتنی ہے اور جیسا کہ میں ابھی کہ چکی ہوں کہ میت کے وارث اس وقت دل کی لگی میں تو سب کچھ کر لیں گے۔ اور بعد میں جب صدمہ زائل ہو گیا تو پھر کون کسی کو پوچھتا ہے۔ اور کون کسی کو دیتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ما جس طرح زندگی میں بچہ کا کھانا پکاتی تھی اسی طرح جو کچھ خدا نے اس کو دیا ہو۔ معمولی کھانا۔ جو وہ روز کھاتی اور کھلاتی تھی اب بھی پکائے۔ شوہر جس طرح بیوی کی موجودگی میں کھانے پینے کا انتظام اپنی حالت کے موافق کرتا تھا۔ اب بھی کرے اور یہ معمولی کھانا ان راتوں کو جن کی گودوں میں یتیم بچے ہیں۔ ان یتیموں کو جن کا پیٹ بھرنے والا خدا کے سوائے کوئی نہیں اپنے پاس بٹھا کر اپنے ہاتھ سے کھلائے۔ اگر آپ اس طرح پھولوں کی رسم انجام دیں اور یہ اہتمام کریں کہ ہا جنمندان کے سوا دوسرے کو جو واقعی حاجت مند نہیں کھانا نہ دیا جائے تو اس کو ضرور انجام دیکھئے۔ اور یہ رسم اس صورت میں آ کر یہ حق کہتی ہو کہ برقرار رکھی جائے۔ افسوس

اس بات کا ہے کہ اس رسم کی جس قدر ممانعت ہو رہی ہے گو وہ ممانعت کے قابل ضرور ہے۔ مگر مخالفین اس کے ساتھ ہی اس کی اصلیت کو بھی پامال کر رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اخوت اسلامی کے جوہر بھی زائل ہونگے۔ اور رفتہ رفتہ اس مذہبِ رسم کے ساتھ ہی ہمدردی کا دشمنانہ جوہر بھی خاک میں مل جائیگا۔

سمرھن کی گفتگو نہ کر باپ اور حسن دونوں اسی صلاح پر متفق ہوئے۔ کہ چھوٹوں کی رسم اس طرح ادا کی جائے کہ کھانا گھر میں پکایا جائے اور حسن اپنے ہاتھ سے لے جا کر ان پردہ نشین رانڈوں کی خدمت میں پیش کرے۔ جن پر کڑا کے کے فاقے پڑ رہے ہیں۔ اور اس رسم کا خاتمہ اسی دن ختم نہ ہو بلکہ ہر شبہ چار آدمیوں کا کھانا دونوں دنت ایسے لوگوں کو دیا جائے جو دائمی حاجمند ہیں۔

سمدھی اور داماد سے یہ گفتگو کرنے کے بعد ماہی کے کمرہ میں آئی جواب علیحدہ مکان سے اٹھ کر ساس کے پاس آگئی تھی۔ دیکھتی ہے تو مشاہدہ ایک آرام کرسی پر پڑی جھول رہی ہیں۔ اور کمرہ میں کتے لوٹ رہے ہیں۔ چاندنی سکرہی ہوئی، درمی تحریکی ہوئی، کاغذ بکھرے ہوئے، کوڑا پھیلا ہوا۔ کمرہ کیا کچھی کی دوکان ہے کہ چاروں طرف ہرقسم کا اسباب موجود ہے۔ آج بیٹی نے اتنی عنایت تو ضرور کی کہ ماکو اٹھ کر کھڑے ہو کر نہیں بیٹھے ہی بیٹھے، اور بیٹے ہی بیٹے، آداب یا تسلیم اور سلام نہیں مانگے پر ہاتھ رکھ لیا۔ مانے دُعا دی۔ ادھر ادھر دیکھا اور کہا:-

”بیٹی! اتنی عورتیں بھری پڑی ہیں۔ اگر کوئی ادھر آگئی تو کیا کہے گی۔ کمرہ بھی ٹھیک نہ کیا۔“

شہرہ۔ ”دونوں ماماؤں میں سے ایک بھی کجبت آج نہ آئی۔ حالانکہ جانتی تھیں کہ کس قدر اشد ضرورت ہے۔“

مال۔ ”ہاں فیملی تو ماماؤں کی ضرور ہے۔ لیکن اسی دن کو تو کہتے ہیں کہ ہم کو

تمام کاموں کی عادت ڈالنی چاہیے۔ تاکہ یہ نہ ہو کہ ایک روز مایا نوکر بیمار پڑ جائے تو ہاتھ ہی کٹ جائیں۔ یہ لوگ کچھ آج ہی پیدا نہیں ہوئے۔ پہلے بھی ذکر کیا کرتے تھے۔ اور ہم نے بھی نوکروں ہی میں آنکھ کھولی۔ مگر ہماری بڑی بوڑھیوں نے نوکروں کو اس نظر سے دیکھا ہی نہیں کہ ہماری زندگی کا تمام دار و مدار ان پر ہے۔ اور یہ ہیں تو کچھ اور نہیں ہیں تو کچھ نہیں۔ باوجود یہ سمجھنے اور ان پر بھروسہ نہ کرنے کے محبت کے تعلقات ایسے ایسے تھے کہ مائیں مکر اور نوکر مجبور ہی ہو کر گھر سے نکلتے تھے۔ یہ نہ ہونا تھا کہ آج کلن کی اماں روٹی پکا رہی ہے تو پرسیوں مرزا کی بہن۔ روز ماماؤں کی بدلی تھی ہے۔ میں نے تو کسی تعلیم یافتہ لڑکی کے پاس پرسیوں کی ماما عام طور پر دیکھی نہیں۔ آج یہ ہے تو کل وہ مرنے والیوں میں یہ کمال تھا کہ اس اُلفت اور اس محبت پر کہ ماماؤں کو اپنے عزیز کے برابر اور رشتہ دار سے کم نہ سمجھتی تھیں۔ یہ ممکن نہ تھا کہ ان پر پھول کر گھر کے کام کاج کو بھول جائیں۔ وہ ماماؤں کو اپنا مددگار سمجھتی تھیں۔ کام خود کرتی تھیں اور مدد ان سے لیتی تھیں۔ میں نے اپنی ان ہی آنکھوں سے ان جتنی بیویوں کو دیکھا ہے جن کے بچے اشرفیوں میں کھیلنے تھے۔ اور پیسوں کی جگہ روپے اٹھاتے تھے۔ مگر میں نے تو ہمیشہ یہ دیکھا کہ ماما کے آنے سے پہلے گھر چندن کر کے رکھ دیا۔ اپنے ہاتھ سے جھاڑو بہاؤ اپنے ہاتھ سے ٹھنڈا گرم پانی۔ ماما آئی اس نے اور کام کئے۔ اس کے ساتھ ہی باورچی خانہ میں گھسیں اور جب تک کھانا تیار ہوا لگی لپٹی رہیں۔ ماماؤں ان کی مددگار ضرور تھیں۔ مگر وہ ماماؤں کی محتاج نہ تھیں۔ تعجب ہے کہ تمہارا دل کس طرح اس کوڑے پر بیٹھنے کو چاہتا ہے۔ مجھ سے تو دم بھر بھی نہ بیٹھا جائے۔ اسی لئے تو بارہ بیٹنی رنجیتی تھی ہو، اٹھنے سے تم کو وحشت، کام سے تم کو نفرت، صحت بگڑے گی نہیں تو سندرگی؟ لاؤ جھاڑو دو میں دوں۔ یہ غصہ بھی کہیں دیکھا کہ گھر میں عورتیں آتی ہوں اور بہو کے کمرے کا یہ ہڈٹا!

شہادہ۔ ”مجھے تو معلوم نہیں وہ کجنت کہاں جھاڑو رکھ جاتی ہے۔“

ماں نے چاروں طرف دیکھا مگر جھاڑو نہ ملی۔ مجبور بچاری نے ایک میلہ کپڑے سے جھاڑو کا کام لیکر گھر کو ٹھیک کیا اور کہنے لگی۔

”کہو بیٹی تم نے ساس کو کیا بھیجا۔ اللہ بخشے کیسی خوبوں کی بیوی تھیں جس طرح مجھ سے کہا تھا کہ سدا بیٹی سمجھوں گی۔ اسی طرح نبیہا گئیں! ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔“

شہادہ۔ ”تجربہ ہے کہ آپ ان کی بھی تعریف کر رہی ہیں۔ جن کو کوئی اچھا نہیں کہتا۔ مجھ کو تو انہوں نے ہمیشہ دشمن سمجھا اور دشمن رہیں۔ آپ ان کی تعریف کرتی ہیں کمال ہو۔ میں ان کو کیا پہونچاؤں گی۔ میرا بس چلے تو جو کچھ ان کو دیاں ملے وہ بھی چھین لیں۔“

ماں۔ ”موت ان ہی کو نہیں آتی۔ جس نے ماں کا پیٹ دیکھا وہ گور کا مشغور دیکھے گا۔ تم کو بھی اور مجھ کو بھی ایک روز یہ ڈانٹ چکھنا ہے۔ مگر کسی کو برا کہنے سے پہلے یہ تو سوچو کہ آخر تم نے بھی کچھ ایسے کام کئے کہ لوگ تم کو اچھا کہیں۔ وہ تمہاری بزرگ تھیں، تمہارے کرتوتوں سے جلتی اور گنوں سے بھلتی تھیں اس لئے خفا رہتی تھیں۔ تم انکو مرے کے بعد برا کہتی ہو۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ مرے کو برا کہنا اچھا نہیں۔ اسکو بھلائی سے یاد کرو کہ وہ خدا کے نزدیک بھی اچھا ہو جائے۔ کیونکہ جو آدمیوں میں اچھا ہو وہ خدا کے ہاں بھی اچھا ہے۔ دنیا میں وہ تمہاری دست نگر تھیں۔ لیکن آج وہ تمہاری مغلج ہیں۔ ان کا تم پر یہ حق ضرور ہے کہ تم جو کچھ تمہارے ہاتھ سے پاؤں سے زبان سے ہو سکے انکی خدمت کرو۔ میں عشا کے بعد اس وقت تک نہیں سوتی۔ جب تک اپنے سب عزیزوں کو تھوڑا تھوڑا پڑھ کر نہ پہنچا دوں۔ ایک سورہ بوسفت اور ایک سورہ بقرہ روزانہ ہوتی ہے کہ اس کا ثواب ان مرنے والوں کو پہونچے۔ تم اس ثواب کی بھی قائل نہ ہو گی۔ مگر اس کی قسمی اس وقت کھلے گی جب عزیز گھری گور اور جنگل بیابان میں سدا کر گھر چلے آئیں گے۔“

میرے پیٹ کو یہ آگ لگی کہ تم جیسی بچی پیدا ہوئی جو زندوں کو کیا مردوں سے

بھی نہ ڈرے رکھتے ڈر خدا سے مرنے کو مرنے سمجھ ادا اس وقت کی بھی کچھ تیاری کر جب یہ شوں شاں اور یہ دھوم دھام خاک بھی کام نہ آئے گی۔ اسی واسطے اللہ بچنے مرنے واسے اس بات کا لحاظ رکھتے تھے کہ بچوں کی زبان سے کسی نہ کسی طرح خدا کا مقدس کلام ادا ہوتا رہے۔ ماں جان عورت ہیں۔ مگر جس حافظ سے جی چاہے مقابلہ کر لودا اسی غلطی پر فوراً ٹوک دیں گی۔ ایک تم بھی مسلمان اور مسلمان کی اولاد ہو کہ درود شریف بھی صحیح پڑھنی نہیں آتی ہو گی۔ اللہ رحم کرے۔

بیسواں باب

”ایک مصیبت تو یہ آئی ہی تھی کہ لڑکھری چھوٹی، اب اس پر غضب یہ ہے کہ ڈیڑھ سو روپے کا قرضہ۔ ڈیڑھ سو روپے سا قرضہ چل نہیں سکتیں۔ ان کے والدین نے صاف انکار کر دیا۔ اب میرا ایک دن یہاں آفت ہو۔ میں نے جو کیا وہ بھگتا اب اپنی غلطی پر نادم اور عقل پر روتا ہوں۔ میں نے دوسرے نکاح کا مزہ چکھ لیا۔ اور اس وقت اس نیک بخت نے صاف طور پر کہہ دیا کہ ”میں اپنے بابا چھوڑ رہا ہوں سا قرضہ ایسی ریت میں پر دیں جا کر کیا کروں کہ تم خود پر کار ہو۔ جب ملازمت کا سلسلہ ہو جائے تو بلا لینا۔“ چار سو روپے جمع کئے اور رکھوائے، اس وقت مانگے تو وہ اور ان کے بابا سب جان کو آگے کہ ”شرم نہیں آتی۔ یہ کیا پیچھے ہیٹھ کر فائدے کرے گی؟“

”راہدہ۔“ یہ تو وہ جانتے اور اس کا کام۔ قرضہ جو ڈیڑھ سو کا ہے۔ وہ تم ادا کر دو۔ دس روپہ ہینہ کے حساب سے جو تم مجھ کو کپڑا لے اور پان چھالیہ وغیرہ کا دیتے تھے وہ یوں کاپوں ہی رکھا ہے۔ میں نے تو کوئی بارہ تیرہ روپے اکٹھے ہیں۔ یہ روپے حاضر ہیں شوق سے لیجاؤ اور دیدو۔“

صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ احسان اگر پہلے ہی

موفقہ پر حسب بیماری میں ددلی بیویوں نے تعلیم قدیم و جدید کے نمونے پیش کئے کوئی نتیجہ نکالنا چاہتا تو اسے صاف معلوم ہو جاتا کہ یہ مسو جو وہ تعلیم نسواں جسٹیک مذہب کے رنگ میں نہ آئے خواہین اسلام کے جو ہر پا مال کرتی رہے گی۔ اس وقت البتہ اس کو ایک چکولالگا۔ اور اس کے دل نے بیباختہ صدا دی کہ زاہد کا پرستش کے قابل بیوی ہے کہ میرے تمام مظالم برداشت کئے اور اُن کی۔ یقیناً اس نئی دہن کی شرارت تھی کہ ایسی سیدھی اور بھولی بیوی کو اس طرح بدنام کیا۔ ابھی یہ فیصلہ یک سوئہ ہوا تھا کہ بیوی نے رومال کی پوٹی ہاتھ میں لاکر دی جس میں روپیہ بندھے ہوئے تھے۔ منصفانہ نظریں اٹھیں۔ اور قدامت کے ساتھ بیوی کے چہرے پر پڑیں۔ تو دیکھا تو کروں پر راج کرنے والی بیگم آج شوہر کے طفیل اس حالت میں ہے کہ کرتہ میں پیوند اور دوپٹہ میل چکٹ !

بیتاب ہو گیا۔ آنکھ میں آنسو آگئے۔ باہر آیا اور چٹخیں مار مار کر دیا۔ روچکا تو آنسو پونچھے۔ قرضہ کا روپیہ ادا کیا۔ سوچ رہا تھا کہ کس طرح بیوی سے جا کر اپنی گزشتہ خطاؤں پر قدامت کا اظہار کروں۔ اور معافی کا طلب گار ہوں کہ ایک رشک نے سامنے سے آکر خط دیا۔ کھولا تو لکھا تھا :-

”ڈیر احسان !

میرے اس وقت کے ساتھ نہ چل سکتے کو تم امر مجبوری سمجھنا ہیں جس طرح تمہاری فرمانبردار ہیں۔ اسی طرح والدین کی مصلحت یہ ہی تھی اور ہے۔ میں مسلمان ہوں اور حقوق اسلام کے بموجب تمہاری زندگی کی شریک۔ کوئی وجہ نہیں کہ تمہارے حکم کی تعمیل نہ کرتی۔ مگر اس مصلحت کا نتیجہ تم کو جلد معلوم ہو جائے گا۔ جس وقت بلاؤ گے میں اسی وقت سر نہکھوں۔ تمے حاضر ہوں گی۔ ہاں ایک بات کا انتظار

کرتے جاؤ۔ میں تم کو تکلیف نہ دیتی۔ مگر یہ مجھ سے زیادہ
 تمہاری عزت کا سوال ہے۔ دسمبر کے چوتھے ہفتہ میں انجن
 خاتین ہند کا اجلاس ہے۔ اور میرا نام شائع ہو چکا ہے۔ تم
 سمجھ سکتے ہو ایسی حالت میں میرا جاننا کس قدر ضروری ہے۔ اس
 وقت تک تو میرا خیال یہ ہے کہ موت کے سوا کوئی طاقت مجھ کو
 وہاں جانے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اس لئے میں سب سے پہلے تم کو اطلاع
 دیتی ہوں۔ کیونکہ میں اس کو نہایت ضروری خیال کرتی ہوں اور اس کے
 بعد ایک اور اشد ضرورت پر توجہ کرتی ہوں۔ اور وہ یہ کہ جلسہ کی شرکت
 قابل میرے پاس کوئی لباس نہیں۔ وہاں لیڈیز، وزانہ کپڑے بدلتی ہیں میں
 کم از کم چار روز میں نو دو جوڑے تبدیل کروں۔ زیور و خیر خدا کا دیا ہوتا تو
 اچھا تھا۔ نہیں تو اب چوری تو کرنے سے ہے۔ ہاں کپڑا تو زرا ڈھنگ کا ہو
 کہ کسی کی نظر میں حقیر نہ ہوں۔ تم کو معلوم ہے کہ مجھ کو مصالحہ وغیرہ سے نفرت
 ہے۔ میں ایسی جگہ ہرگز روپیہ صرف کرنا پسند نہیں کرتی جہاں روپیہ کا بیسہ بھی
 نہ رہے۔ البتہ جو ضروری چیزیں ہیں ان سے منہ نہیں۔ دو جوڑے زیادہ
 سے زیادہ ڈیڑھ سو روپیہ میں تیار ہو جائیں گے۔ اگر تم ہزار کا حساب
 بیباق کرو تو اس رقم کے ساتھ ہی اس کا بھی فکر کر لینا۔ اور اگر اس میں ذقت
 ہو تو میں ہرگز ہرگز تم کو ادبیت دینی نہیں چاہتی۔ تم اسی سے قرع کا انتظام
 کرو وہاں سے بھی لینا۔ میں تم کو تکلیف نہ دیتی اب جانو کہ دینی وہ بنوادی ہے۔
 اور میں نے یہی سوچا بھی تھا۔ مگر اب جو غور کرتی ہوں تو مجھ کو ایسی فرحت
 کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میں طبیعت کچھ ایسی ہی لے کر آئی ہوں کہ ناجائز
 مطالبہ کو پسند نہیں کرتی۔ مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ اپنے اخراجات ان کے

اوپر ڈال دوں۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تم کو مفصل کیفیت سناؤں۔ میں اگر معمولی لباس میں شریک ہوئی آؤں تو خدا نخواستہ ہونے ہی کیوں لگی۔ تو مجھ سے زیادہ تمہاری آبرو پر بانی پھڑکے۔ میں اس موقع پر خاموش بھی ہو جاتی۔ اور مالدیتی۔ مگر خدا خدا کر کے تو سال بھر میں یہ موقع نصیب ہوتا ہے کہ کچھ قوم کی خدمت ہو سکے۔ اور شاید یہی کام خدا قبول فرمائے۔ دوسرے مسلمانوں کی جو حالت ہیں اور کی تو نہیں کہہ سکتی۔ میری کیفیت یہ ہے کہ دیکھ دیکھ کر تڑپتی ہوں۔ امید ہے کہ یہ تجویز میں ضرور کارگر ہوں گی۔ اور مسلمان عورتیں جہالت کے گڑھے سے نکل کر علم کی روشنی سے منور ہوں گی۔

تم کو اس کے انتظام میں اگر زیادہ تردد ہو تو میں ایک اور تدبیر بتاتی ہوں۔ تمہاری بیوی صاحب کے پاس بہت سا زبور ہے جس کو وہ ہمیشہ دوسرے کی امانت بتاتی ہیں۔ حالانکہ میں خود اُن کو استعمال کرتے دیکھ چکی ہوں۔ وہ اس قدر کافی ہو کہ نیکو سال دو سال بھی لو کر ہی نہ لے تو پریشانی نہ ہوگی۔ اس میں سے تم ڈیڑھ سو روپے کا انتظام کر سکتے ہو۔ میں نے خود ہی یہ پرچہ تم کو لکھا ہے۔ ابھی گھر میں کسی سے ذکر نہیں کیا۔ اباجان تمہارے پاس آئے کا قصد کر رہے کہ لڑکی کے اخراجات کا انتظام عدالت کے ذریعہ سے کر لیں مگر میں نے ان کو روک دیا اور کہا کہ اب اس کا فکر نہ کیجئے۔ میں نے ان کو منع کر دیا۔ مگر تم جس طرح ہو اس انتظام راج ہی کر دو۔ ایسا غضب نہ کرنا کہ یوں ہی چلے جاؤ۔ کیونکہ اباجان کی عادت سے تم واقف ہو وہ پھر روکے نہ رکھیں گے۔

ایس۔ احسان

خط کے پڑھتے ہی احسان کے چھٹکے چھوٹ گئے۔ اور ہوش جاتے رہے۔
 اٹھا۔ ایک سرسبز شاداب قطعہ پر جہاں سبزہ کا مخی فرش چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔
 بیٹھا۔ اور سوچنے لگا کہ بیٹیم بٹھائے کس مصیبت میں پھنس گیا ہیں تو سمجھا تھا کہ سکول
 کی تعلیم پائی ہوئی بیوی میری زندگی درست کر دے گی۔ مگر یہ کجنت تو اس کی چھینچند رہ گئی۔
 کچھ ایسی پڑھی لکھی بھی تو نہیں۔ فقط لباس اور گفتگو ہی تعلیم کی دیکھ لو۔ زراہن کی قابلیت
 اس سے ہزار درجہ اوپر اس کی عادتوں و خصالت اس سے لاکھ مرتبہ فاضل ہے۔ ایسا اس خط
 کا کیا جواب دوں۔ یہ تو ایسے شو سے پشت لوگ ہیں کہ اگر نکار کرنا ہوں تو نہ معلوم کس
 مصیبت میں ڈلوادیں گے۔ خیر اب ایک صورت ہے کہ میں بھی چالاکی سے کام لوں
 اور کسی طرح ان مکاروں کے پھندے سے نکل کر گھر پہنچوں۔ وہاں پہنچ کر تو میں انکی
 ہوشیاری و مکاری سب سمجھ لوں گا۔ لیکن اس معاملہ میں زراہن کی صلاح ضروری ہے۔
 یہ فیصلہ کراہیات گھڑا یا تو زراہن کی صورت ظاہری ایک نشتر تھا جو اس کے
 کلیجہ میں گھسا۔ وہی بیوی جو سچ مچ کی بیگم تھی۔ اس وقت لونڈیوں کے ہڈے میں نظر آئی
 خیال کیا تو اس تمام انقلاب کا ذمہ دار احسان اور صرف احسان۔ زیادہ غور کرنے لگا تو
 نفس نے ملامت کی اور آواز بلند کہا کہ اس تغیر پر بھی اس کے جوہر اسی آب و تاب سے
 چمک رہے ہیں۔ اس نے اپنے فرائض کی ادائیگی میں اس وقت تک کسر نہ کی اور اب تک
 کہ میں نے اس کو ان حالوں پہنچا دیا۔ اسی طرح میری عزت کی خواہاں اور میرے بھر
 کی جو یا ہے۔ آگے بڑھا اور وہ خط دکھا کر کہا :-

”لو اب بتاؤ میں کیا کروں؟“

زراہن نے خط پڑھا اور کہنے لگی :-

”ان کا یہ کہنا غلط ہے یا صحیح یہ تو تم ہی فیصلہ کرو مگر اس میں کیا کلام ہے کہ اب

وہ اپنی ضرورتوں کا اظہار تم سے نہ کریں تو کس سے کریں۔“

احسان۔ ”تو کیا تم اس پر رضا مند ہو کہ میں تمہارے زیور میں سے ڈیڑھ سو روپے دیدوں۔“

زاہرہ۔ ”میں تمہاری ضرورت کے مقابلہ اور تمہارے حکم کے سامنے انکار کی مجال تو نہیں رکھتی۔ مگر یہ ضرور کہوں گی کہ وہ چونکہ میری ملکیت نہیں اس لئے مجھے اس کے دینے کا بھی حق حاصل نہیں۔ تمہاری ملکیت ہے۔“

احسان۔ ”پھر کیا کرنا چاہیئے۔ افسوس یہ ہے کہ میں دونوں جہان سے گیا۔ تمہاری تکلیف کا بار میری گردن پر سخت ہے۔ اور مجھے اس کا صدمہ ہے کہ میں نے غلطی کی۔“

زاہرہ۔ ”میرا تو تم مطلق خیال نہ کرو۔ میں جس طرح پہلے تمہاری لونڈی تھی آج بھی ہوں اور انشاء اللہ ہمیشہ رہوں گی۔“

احسان نے دل میں کچھ فیصلہ کیا۔ اور بیوی سے صرف اتنا کہہ کر باہر آیا: ”اسباب وغیرہ باندھ لو۔“

گاڑی کرایہ کی کی اور کہا ”مغرب کے بعد لے آنا۔“ شام ہوتے ہی احسان زاہرہ سمیت گاڑی میں بیٹھ روانہ ہو گیا۔

مغربی تعلیم یافتہ بیوی کا دھڑکا ٹپکے سے کم نہ تھا۔ رستے بھر احسان کو کھٹکا رہا کہ اب کوئی آیا۔ اور گاڑی روکی۔ صبح چار بجے کے قریب اسٹیشن پر پہنچے تو سردی خوب شدت سے تھی۔ مسافر خانہ کے کمرے میں لیجا کر بیوی کو ٹھہرایا۔ یہاں ایک لمبی تپائی پر ایک مسلمان خاتون لیٹی ہوئی تھی۔ اسکی آنکھوں پر عینک تھی۔ اور لباس کی کوئی چیز انگریزی عورتوں سے کم نہ تھی۔ ہاتھ میں کتاب تھی۔ اور نگاہ نیچے۔ ایک عورت فرش پچائے اور اپنے بچہ کو لٹا سے بیٹھی تھی۔ زاہرہ کا خیال تھا کہ بڑھی بکھی بیوی اسکی رت بچہ کر

اُٹھ کھڑی ہوں گی۔ تپائی چونکہ سرکاری ہے کم سے کم اتنا تو کہیں گی آئیے بیٹھ جائیے۔ مگر اس کا خیال پورا ہونا تو درکنار اُن بیوی نے نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ زلزلہ نے دوسری طرف دیکھا تو دوسری تپائی اسباب سے رُکی ہوئی تھی۔ دوسری بیوی سے پوچھا "یہ اسباب آپ کا ہے؟"

"عورت۔" "جی نہیں ان یم صاحبہ کا ہے۔"

تعلیم یافتہ۔ "کیوں آپ کا کیا مطلب ہے۔"

زادہ۔ "میں بیٹھنا چاہتی ہوں۔"

تعلیم یافتہ۔ "آپ نیچے بیٹھ جائیے۔ یہ پنج آپ دیکھتی ہیں رُکی ہوئی ہے۔"

مہربانی فرما کر دروازہ کھول دیجئے کہ تازہ ہوا آتی رہے۔"

اتنا کہہ کر تعلیم یافتہ بیوی نے کتاب پڑھنی شروع کی۔ کتاب تو اردو ہی کی

تھی۔ مگر الفاظ یہ تھے:-

اے۔ کیٹ۔ دین

A cat ran

دس بک از مان

This book is mine

زاہل کا کو ناگوار تو بہت ہوا زیادہ تر اس لئے کہ انٹی انگریزی وہ بھی

سمجھتی تھی۔ جلی بھی اور نہی بھی۔ مگر ضبط کیا اور دروازہ کھول دیا۔

تعلیم یافتہ۔ "تھینک یو۔"

عورت۔ "ایک ذرا اوپر کا کوڑ بھیر دیجئے کہ ہوا بہت تیز ہے اور

میرا بخار زدہ بچہ اچھلا پڑتا ہے۔"

تعلیم یافتہ۔ "ہیئے آپ سے کہا کہ ایک آپ کے بچہ کی دھڑ سے دوسرے

پیار نہیں ہو سکتے۔ آپ دیکھتی ہیں کہ تازہ ہوا کے داخل ہونے کا یہاں کوئی راستہ نہیں۔ صرف یہ دور و شندان ہیں جو کافی نہیں ہو سکتے۔ یہاں آدمی چار میں ہم کو کافی آکسیجن کی ضرورت ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم کاربن میں رہیں۔ آپ کو کوئی حق نہیں کہ اپنے پیار بچے کو لیکر سفر کیجئے۔ اور دوسروں کو ادبیت پہنچائیے۔

عورت۔ "نہیں بی بی میں تو تکلیف نہیں پہنچا رہی۔ آپ دیکھ لیجئے یہ بچہ بخار میں لہلہ رہا ہے۔ ہوا اس کے واسطے دھیرے۔ آپ کی اجازت نہیں ہے تو کواڑ کھلو لیجئے۔ میں اس کو دیکھا کر ادھر منہ کر لوں گی۔"

زاہدکا نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو بچہ بخار میں لوثہ تھا۔ اور کھانسی اس شدت کی تھی کہ نیلا پڑا جاتا تھا۔

تحلیم یا فتمہ۔ "آپ اگر پڑھی لکھی ہوتیں تو آپ کو معلوم ہوتا کہ اس بچہ کی اس طرح کھانسی سے مجھ کو کس قدر تکلیف ہو رہی ہے۔ آپ اس کو بیمار کھتی ہیں۔ مگر اس کے کھانسنے کی آواز شیر سے کم نہیں۔"

عورت۔ "بی بی یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ کہ میں کھانسی روک لوں۔ میں مجبور ہوں۔"

تحلیم یا فتمہ۔ "آپ باہر جائیے۔ دیکھئے وہ برابر کھانسی رہا ہے۔ اور یہ بچہ میں کیسی خطرناک آواز نکال رہی ہے۔"

خانساں نے آواز دی کہ "چائے حاضر ہے۔"

تحلیم یا فتمہ۔ "لے آؤ۔"

خانساں اندر آیا۔ عورت اور زاہدکا اُٹ کر کچے بیچہ گئیں۔ اور تحلیم یا فتمہ نے چائے بسکٹ اور انڈے کھا کر خانساں کو رخصت کیا اور عورت سے کہا:۔
"آپ اس کو ایک انڈا اور دو سپون چائے دیکھئے۔"

عورت۔ ”میرے پاس پیسہ مطلق نہیں۔“

تعلیم یافتہ۔ ”افسوس۔“

زادہ۔ ”آپ نے خاندان کو اندر بلا لیا۔ حالانکہ آپ کو معلوم تھا کہ

یہاں دو پردہ کرنے والی عورتیں موجود ہیں۔ یہ مکہ پردہ نشین عورتوں کے

واسطے مخصوص ہے۔ آپ کو کوئی حق نہ تھا کہ آپ اس کو اندر بلا تیں۔“

تعلیم یافتہ۔ ”آپ بھی مسلمان ہیں۔ اور میں بھی لیکن آپ پرانی عورتوں

کی طرح جاہل ہیں۔ اور اسلام کو مطلق نہیں سمجھتیں۔ میں اسلام کو آپ سے بہتر

سمجھتی ہوں۔ پردہ جس قدر ضروری ہے اور جو اسلام کا حکم ہے اس کے

خلاف کچھ نہیں ہوا۔“

زادہ۔ ”مکن ہے کہ آپ اسلام کو ہم سے بہتر سمجھتی ہوں۔ مگر آپ

ہمارے جذبات کا خیال رکھنا ضروری تھا۔ کیا تعلیم کے پیسنی ہیں کہ دوسروں کے

جذبات کا بے دردی سے خون کر دیا جائے۔“

تعلیم یافتہ۔ ”آپ نے پردہ کے اصول پر بھی کبھی توجہ کی۔ یہ آپ کا

پردہ پردہ نہیں۔ قہر ہے جو شرع اسلام کے بالکل برخلاف ہے۔ ضرورت ہو

کہ آپ نہ سہم کو سمجھ کر زندہ رہیں۔ ورنہ یہ زندگی فضول ہے۔ اگر آپ زیور تعلیم سے

آلاستہ ہو جیتیں۔ اور قوم کا درد آپ کے دل میں ہوتا تو آپ کی زندگی سے مسلمان

فائدہ اٹھاتے۔ جس بُری طرح مردوں نے ہمارے حقوق پال کئے ہیں اور ہم کو

انسان سے جانور بنا رکھا ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ہم آفرینان ہیں

اور اپنی ذلت کو اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔“

اوہ۔ اوہ کیسی سنت تکلیف اس لڑکے کی کھانسی سے ہوتی ہے۔

باہر دیا تو باہر جادو۔ ہم لوگ اتنا نہیں سمجھتا کہ دوسروں کو تکلیف دینے کا نام کو

کیا حق ہے۔ اگر تم باہر نہیں جاتیں تو ہم تم کو زبردستی نکال دیگا۔ اور ابھی تمہارا رپورٹ کرتا ہے۔“

عورت۔ ”بیوی ذرا باہر نکل کر تو دیکھو ہوا غضب ڈھا رہی ہے۔ اس پھول کو مار دے گی۔“

تعلیم یافتہ۔ ”پھول پھول مست ہو۔ یہ تم کو پھول ہے ہم کو نہیں۔ انسان کا بچہ ہے۔ ہوتا ہے مرتا ہے۔ دوسروں کو اذیت منتا دور۔ چلو۔ نہیں ہم ابھی رپورٹ کرتا ہے۔“

عورت نے بچہ کو منہ کالا اور تعلیم یافتہ بیوی کا منہ نکلتی ہوئی باہر اٹیچی۔ زارہ کا یہ منظر دیکھ کر لرز گئی اور خود بھی برقع اوڑھ باہر چلی آئی۔ عورت کی حالت نہایت خراب تھی۔ بچہ نے اس کی آنکھوں میں دنیا اندھیر کر دی تھی۔ اس کے منہ کو نکلتی تھی، پیار کرتی تھی، روتی تھی اور بیتاب ہوتی تھی۔

زارہا نے پوچھا:-

”یہ کب سے بیمار ہے۔ آپ اس کو کیا دوا دے رہی ہیں۔ اور آپ کو

جانا کہاں ہے؟“

عورت۔ ”بیوی کیا بتاؤں۔ کیوں پوچھتی ہو۔ کیا فائدہ دنیا کے جھگڑے ہیں۔ چل رہے ہیں۔ جیسا تک زندہ ہوں چلتے رہیں گے۔“

زارہہ۔ ”آزاد آپ بتائیے تو سہی بتانے میں کیا نقصان ہے؟“

عورت۔ ”میں شاید یہاں پور کی رہنے والی ہوں۔ وہیں بیباہی گئی میرے والد پہاڑ پر نوکر تھے۔ نہ لڑی میں ہمارا تمام مکان اور آدمی دب گئے۔ اور میرے ستر ماں باپ دونوں کا سایہ اٹھ گیا۔ ایک شخص سے جس کا نام بھول گئی ہم کو اگلا طلاق دی کہ میری ماں جان مرنے دفعہ زیور کی کے سپرد کر گئی ہیں۔ کسی معتبر آدمی کو

بھیکر وہ منگو الو۔ کوئی صاحب مدرسہ میں احسان نہیں ان کی بیوی کے پاس امانت ہے۔ میرے میاں بیمار تھے۔ اور ہمارے پاس اتنا روپیہ بھی نہ تھا کہ اتنی دُور کا سفر کر سکیں کہ ان کی بیوی کی آٹا کا خط آیا۔ اور ہم پہاڑ روانہ ہو گئے۔ میاں بیمار تھے۔ پہاڑ پہونچکر اور بھی مرض بڑھ گیا۔ اور پانچ روز میں پٹ پٹ ہو گئے۔

بیوی کس کس کو روؤں ماں باپ کو شوہر کو! میں کیلی یا یہ دو برس کا مصمم پتہ پوچھ پوچھ احسان صاحب کی بیوی کے پاس پہونچی۔ انہوں نے وہ گالیاں دیں کہ خدا کی پناہ۔ اُن کے آبا مار نے کیلئے دھڑے۔ اور گھر سے نکال دیا۔ سر لئے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے شرارت میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ ایک رات سرائے میں کاٹنی قیامت ہو گئی۔ اسی حالت میں دن نکلنے ہی وہاں سے بھاگی سڑک والے نے جو اسباب تھا وہ اپنے داموں میں چھین لیا۔ اب میرے پاس سوا اس ٹال کے جو میری گود میں ہے۔ یا ان کپڑوں کے جو بدن پر ہیں اور کچھ نہیں ارادہ ہے کہ پاؤں پاؤں چلی جاؤں۔ بیوی اس بچہ کو کیا پوچھتی ہو بن باپ کا بچہ ہے۔ اگر اس کا باپ ہوتا تو وقت مجھ پر یہ مصیبت نہ ڈھاتا۔ اور میں اس کے واسطے ایک ایک پیسہ کے شربت کو نہ ترستی۔ یہ بن باپ کا بچہ سبب وارت کا ہے۔ جس کو تمہارے سامنے میرے ہی جیسی ایک عورت نے جو خود بھی اولاد والی ہو گئی۔ کھانسنے کے جرم میں مسافر خانہ سے باہر نکال دیا۔ خدا کے واسطے بیوی! دیکھو تو سہی یہ کیسے سانس لے رہا ہے۔ اسے شکوہ میری گود پر دیں میں خالی نہ کیجیو! اسے چاند آنکھ کھول! اسے بیوی سنہ کھولے دیتا ہے لہذا اپنے بچوں کا صدقہ اپنے ہاتھ پاؤں کا طفیل! میرے کلیجہ کا ٹکڑا صرف اتنی دیر گود میں رکھ لو کہ میں بھیک مانگ کر اس کے واسطے تھوڑی سی چار سے آؤں۔ اسے بیوی

خدا کے واسطے بتاؤ اس کو کیا ہو رہا ہے؟

زاہدہ - ”آپ گھبرائیے نہیں خدا پر بھروسہ رکھئے وہی فضل کرنے والا ہے۔ بچہ کو آپ شوق سے میری گود میں دیدیجئے۔ آپ کو خود جانے کی ضرورت نہیں میں ابھی چائے منگواتی ہوں۔“

اتنا کہہ کر زاہدہ اٹھی اور احسان سے چائے کی پیالی اور ایک انڈا منگو کر بچہ کو دیا۔ بچہ اہل میں سردی مان گیا تھا۔ چائے پیتے ہی آنکھیں لگیں اور ماں سے کہنے لگا۔

”بیوی بھوک“

قارون کی دولت روئے زمین کی سلطنت کوئی چیز ایسی نہ تھی جو ہر نصیب ماں کی نگاہ میں ان دو لفظوں سے زیادہ وقعت رکھتی۔ فرط محبت میں بیتاب ہو کر چٹ گئی۔ زاہدہ نے انڈا چھیلا اور بچہ کو دیا۔ اوپر تو چائے پی۔ اوپر کھایا انڈا، اوپر سے زاہدہ نے یہ ہش باری کی کہ چاروں طرف سے رضائی سمیٹ کر خود ہوا کی طرف بیٹھی اور بچہ کو اچھی طرح دبکایا پسینہ آیا اور اس شدت سے کہ اس جاڑہ میں زاہدہ کے دانت سے دانت بچ رہے تھے۔ اس کی گود اور بچہ کے کپڑے سب چوڑا گئے۔ اب زاہدہ کی جان میں جان آگئی۔ اور عورت سے کہا:-

”آپ وہ خط مجھ کو دکھا سکتی ہیں۔ جو آپ کے پاس زیور کے سلسلے میں گیا تھا۔ عورت - ”جی ہاں یہ اوپر ہی رکھا ہے دیکھئے۔“

زاہدہ نے خط دیکھا تو ماں کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ یہ منت کہا آپ وقین روز کے واسطے میرے ساتھ تشریف لے چلئے۔“

عورت - ”بیوی آپ کے احسان کا میں کسی طرح شکریہ ادا نہیں کر سکتی

آپ نے جو سلوک میرے ساتھ کیا اس کا اجر آپ کو خدا دیگا۔ میں نے اس سفر میں مسلمان مردوں کا جو تجربہ کیا خدا اس سے سب کو بچائے۔ آپ تو یہ دعا کیجئے کہ میں کسی طرح اپنے گھر پہنچ جاؤں۔ پھر انشاء اللہ گھر سے باہر قدم نہ رکھوں گی۔ روکھی روٹی اور چنے اچھے۔ اپنا کونہ بھلا اور آپ بھلے۔

زاہدہ۔ ”آپ کا یہ فرمانا نہایت درست ہے۔ مگر آپ مجھ پر بھروسہ کیجئے۔ میں آپ کو اپنی حقیقی بہن کی طرح رکھوں گی۔ آپ کی عزت اپنی عزت اور آپ کی تکلیف میری اپنی تکلیف ہو۔ میں اس کا شہر خدا کو کرتی ہوں کہ آپ کو دغا نہ دوں گی۔“

عورت۔ ”خدا سے زیادہ تو کوئی نہیں ہے۔ اور آپ کے احسانات نے مجھ کو دائمی گرویدہ کر لیا ہے۔ اگر آپ یقین دلاتی ہیں تو بہت اچھا۔ مگر میرے پاس کرایہ نہیں ہے۔“

زاہدہ۔ ”آپ اس کا خیال نہ کیجئے۔“

عورت۔ ”اتنا خیال رکھئے کہ میں ایک بد نصیب عورت ہوں۔ گو میرے سر سے وارث اٹھ گیا اور میں تنہا ہوں۔ مگر آپ کی نیت میں خرابی ہوتی تو میری جان کا اور اس بچے کا عذاب آپ کے سر ہوگا۔“

زاہدہ۔ ”آپ کیا فرما رہی ہیں۔ اور کیا سمجھ رہی ہیں۔ آپ مطمئن رہئیے۔ آپ کو دھوکا نہ ہوگا۔“

زاہدہ احسان اور عورت تینوں گھر پہنچے۔ عورت نے دروازے میں کھڑے ہو کر پہلے اپنا اطمینان کیا۔ عورتوں کے بوسنے کی لڑکیوں کے کلام اللہ پڑھنے کی آواز سے دل ٹھٹھا کا تو اندر داخل ہوئی اور ایک کونہ میں چکی پیچ گئی۔

زاہدہ نے اس سے مفصل کیفیت بیان کی تو اس نے ویرستی بلا کر اندر بیٹھایا اور بھائی کو جو شاہجہاں پور گئے تھے بلایا۔ انہوں نے بچہ کو پہچانا۔ خط موجود ہی تھا۔

زاہدہ نے چپکے سے زیور کی پوٹلی نکالی اور سامنے لا کر رکھی۔ عورت کی آنکھ سے خوشی کے مارے آنسو نکل پڑے۔ اور جب یہ الفاظ سُنے کہ

”بیوی معاف کرنا میں نے اطمینان کی وجہ سے یہ دہر لگائی۔“

تو دوڑ کر پیٹ گئی اور کہا:-

”میں آپ کے احسان جنتک زندہ ہوں فراموش نہیں کر سکتی۔“

زاہدہ:- ”یہ آپ کا کرم ہے میں نے درحقیقت آپ کو اسی واسطے تکلیف دی تھی۔ کیونکہ اہاں جان کا خط میں نے وہیں پہچان لیا تھا۔ اب یہ آپ کا گھر ہے جب تک جی چاہے شوق سے رہیے۔ اگر آپ جانا چاہیں تو میں نے ماموں جان کو رضامند کر لیا ہے۔ وہی آپ کے پاس گئے تھے۔ ضحیف العمر آدمی ہیں اطمینان سے پہنچا دیں گے۔“

عورت:- ”ہاں اگر اب گاڑی کا وقت ہو تو مجھے بھجوا دیجئے۔“

زاہدہ:- ”جی ہاں وہ اسی وقت کی گاڑی میں آپ کے پاس گئے تھے میں نے دریافت کیا تھا۔“

عورت:- ”بہت اچھا۔“

زاہدہ نے گاڑی منگوائی۔ جب عورت دروازہ میں پہنچی تو صاحبِ کار نے آکر بہان کو گلے لگایا اور کہا:-

”یہ کھانا رکھ لیجئے رستہ میں کام آئے گا۔ یہ زیور اس بچہ کی تعلیم کیلئے رکھیے اور اپنے اخراجات لستم لستم پورے کیجئے۔ یہ کچھ روپے ہیں۔ آئندہ پھر پہلی تاریخ کو جو کچھ میں بھیجوں اپنی عنایت سے قبول فرما کر مجھے ممنون فرمائیے۔“

گاڑی موجود تھی۔ عورت اپنے بچہ کو لیکر اندر بیٹھی۔ بڑے میاں باہر اور اس طرح زاہدہ اپنے بہان کو رخصت کر بارامنت سے سبکدوش ہوئی۔

اکیسواں باب

بے شمار پھول باغوں میں کھیلے اور مرجھائے۔ لانا اور روہیں دنیا میں آئیں اور گئیں۔ آج ان پھولوں کا نشان اور ان زندگیوں کا پتہ دنیا کے حیات میں نہیں۔ پھول مرجھائے کو پیدا ہوئے، اور زندگیاں تاپید ہوئے کو آئیں، فنا ہوئے والے پھول نہیں ہیں۔ ان کا سراغ نہ لگے۔ مگر ان کی مہکا رہی ہوا میں موجود ہے اور بل کے بسے ہوئے پران کی زندگی کا نشان دے رہے ہیں۔ مرنے والوں کی ہڈیاں گلہ کر خاک ہو گئیں۔ ہوا ان کا غبار تاراج و برباد کر چکی۔ مگر ان کے کارنامے ابھی اس دنیا میں ہیں۔ اور جب تک دیکھنے والی آنکھیں موجود ہیں روشن رہیں گے۔ وقت اسلام کے درخشندہ جوہر خاک میں ملا چکا۔ اور وہ پاک نفوس جو اسلام بول بالا کر گئے۔ خود زمین کی تہ میں اور ان کے نام آغوش تاریخ میں بے خبر پڑے سوتے ہیں۔ بسا غنیمت تھی۔ انیسویں صدی عیسوی کے مغرب کی خوشنما پری کا جن صرف مردوں ہی کی آنکھیں ستر کر رہا تھا اور اسلام کے سدا بہار پھول گھروں کے چپے چپے پر مہک رہے تھے۔ مگر قیامت تھا۔ بیسویں صدی کا آغاز کہ یہ روایتی ہوئی گھروں کے اندر پہنچی اور مایہ ناز ہستیاں جو عدوت کی حیثیت میں مسافر اسلام کے نقش پا کا نشان دے رہی تھیں۔ شرابور ہو گئیں۔ لڑکیوں کی تعلیم جدید کا غلغلہ در و دیوار سے بلند اور ترقی قوم کی صدائیں دڑے دڑے سے اوجھ رہیں۔ کوشش محقول اور صد استحسن تھی۔ کاش دائرہ مذہب کے اندر اور اصول اسلام سے وابستہ ہوتی۔ مگر زمانہ کی رفتار خیر آباد رہا تھا جس لئے تھی اصول چن چن کر اور روایات چھانٹ چھانٹ کر بیچ کیں۔ آبائی جوہر بال بال اور ارکان مذہب دبا کر دیئے۔ لڑکیاں آزادی کی ہوا میں ترقی کے نعرے لگاتی مشرق پر یں طعن کرتی مغرب

میدان میں اُتریں۔ مذہب سے جھگڑاتے زیور تار کر الگ پھینکے۔ اور آج وہ وقت ہے کہ جن گھروں میں صدائے ”اللہ اکبر“ کلیجہ دھلا دیتی تھی۔ اور گھر والوں کے سر مالک حقیقی کے حضور میں جھک جاتے تھے۔ وہاں مؤذن کی اذان گونجتی ہوئی جا کر اور موسیقی سے ٹکراتی ہوئی واپس ہوتی ہے۔

زمانہ اس رنگ کو بہت کچھ چمکا کر چکا۔ تعلیم جدید کی شہدائے ہونگی خاک نہیں۔ مگر جھپٹیں گی کہ ہم تعلیم یافتہ اور برتری بول دھیاں عاقل مطلق۔ مگر گمان غلط اور ہم لغو ہو گا۔ اگر ایمان کی روشنی دل میں موجود نہ ہو تو انصاف کی نظریں اُونچی کر داور ان صورتوں کو دیکھ لو۔ جو اب کوئی ذمہ کی مہمان ہیں۔ یہ سماں جلد بہت جلد اکٹھے اور جھل اور نظر سے چھپنے والا ہے۔ ترقی کے نعرے لگاتے ہوئے غول سرکوں پر کھائی دیں گے۔ مگر کہ لوں میں دیکھ کر ترقی کی دعائیں مانگنے والیاں زمین کا پیوند ہونگی۔ یہ وقت نہ ہو گا، اور یہ باتیں خواب و خیال ہو جائیں گی۔ مگر وہ دن آئے گا

اور ضرور آئے گا کہ مسلمان جس کو منزل مقصود سمجھ رہے ہیں وہ بیابان قیامت بن کر ہو گا۔ موجودہ تعلیم نسواں اس لئے کہ مذہب کا سالن دگمان تک نہیں وہاں جان بچا کر آسمان اس وقت بتا دے گا کہ وہ آئن بان و ابیاں جو آج قبرستان کی زینت ہیں۔ لاریب مسلمان تھیں۔ یہ تو ہر قدر امت مسلمہ کے اور اب رسوا ایک آؤٹ گھر کے دن کا نام و نشان تک نہیں۔ مگر وقت آئے گا۔ آئے گا اور ضرور آئے گا کہ دنیا بھر اسلام ان واقعات کو آنکھوں پر رکھے گی۔

بے غیرتی کی انتہا اور بے حدی کی حد تھی کہ یہ کچھ ہو گیا۔ مگر سناھن کا بر نصیب کے کان میں جو شیشیاں تہذیب جدید کی گھس چکی تھیں وہ نہ نکلیں۔ عزت گئی، آبرو گئی، باپ دادا کا نام و بابت بزرگوں کی ناک کٹی۔ اور اگر بیچ پوچھو تو صورت دکھانے کے قابل اور دھنہ سامنے کرنے کے لائق رہی۔ مگر یہی ہوئی عادتیں چڑھے ہوئے رنگ اور پڑے

ہوئے لپکے کسی طرح نہ چھوٹتے تھے۔ اور نہ چھوٹے۔ ماں کے بعد باپ نے یہ سمجھا اور سمجھا
 کیا سمجھنا چاہیے تھا۔ کہ یہ جو کچھ ہے سب حسن کا جینے جی اس کا۔ مرے بعد اس کا۔
 پھر میں نے کیوں چار دن کی زندگی کے لئے بُرائی سہلی۔ بیٹے بہو کو بلا گھر بار چیز
 علاقہ جائیداد سب سپرد کر دیے۔ بٹا نو پہلے ہی لیا تھا۔ مگر پورا قبضہ اب ہوا حسن
 ٹھوکر کھا چکا تھا۔ اور ایسی کہ پہلے ہی حلے میں تارے دکھائی دے گئے۔ مگر مغربی
 تہذیب کی دلدادہ تعلیم یافتہ بیگم کے بھانویں بھی نہ تھا۔ روپے کی ریل پیل ہونے ہی
 وہی بیوی تھیں۔ اور وہی کلب کے جلسے، آزادانہ تفریح، اور دروازہ سپر۔ بیوی کا
 واقعہ حسن کو راہ راست پر لے آیا۔ اور محنت و کمالت سب رفوچکر ہوئی۔ خد کے سامنے
 سر بھی جھکنے لگا، اور زبان بھی۔ جو شخص مسلمان سے سپردھے منہ بات کرنا کسر نشان
 سمجھتا تھا وہ کوڑا کرتے جاڑوں میں صبح کی نماز غلسوں اور غریبوں کے برابر کھڑے ہو کر
 جماعت سے پڑھتا۔ اب البتہ میاں بیوی کے مزاج میں زبردست اختلاف کی بنیاد
 پڑی۔ میاں مغرب کا دشمن، اسلام کا شہید، اجدت سے نفرت، شہرت سے دشت !
 بیوی ترقی کی عاشق، مذہب سے دور، نام کی غلام، کام کی دشمن، احسن کو دقت نے
 ٹھیک بنایا۔ اور حسن کا رنگ دیکھ کچھ تو صحبت کا اثر اور کچھ دکھائی دی موت۔ باپ
 بھی اسی طرف ڈھلا۔ اب گھر میں ترقی کی حافظ اگر تھیں تو بی شاہلا۔

گلابی جاڑے تھے۔ رمضان کا مہینہ شروع ہوا۔ شاہلا کا رٹ کا اسوقت
 خاصا ماشا را اللہ دس سال کا تھا۔ اور گوماں کی صحبت سننے بھی اور تربیت سننے
 بھی اس کا ناس کرنے میں کمی نہ کی تھی۔ مگر باپ کی احتیاط اور احتیاط کیسا تھوکنش
 نے اس کو ٹھوٹا بہت مسلمان بنا دیا تھا۔ روزہ کی خبر شاہلا بہت زور سے سن رہی
 تھی۔ اور سن رہی تھی۔ تیر ہواں روزہ تھا کہ حسن نے ساس کو بلایا۔ اور اس کے
 سامنے بیوی سے کہا:-

”کل منجھلا روزہ ہے۔ بچہ کو روزہ رکھوادو۔ آخر یہ بھی ہم پر فرض ہے۔ اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔“

نشاہدہ۔ ”فرض کی خوب کہی۔ اس کا روزہ ہم پر فرض۔ یہ اس سے بھی تیز رہی۔ تعجب تم پر ہے کہ ایک ایسی یہ تمہاری عقل کو کیا ہو گیا کہ ان دھوکہ سلوں کا کلمہ پڑھنے لگے۔ روزہ کی ضرورت اسلام کے ابتدائی دور میں بیشک تھی۔ اس لئے کہ مسلمان یوں بھی فائدہ مرتے تھے۔ روزہ کے لالچ نے ان کو ثواب عاقبت کی تقویت دیدی۔ مگر اب روزہ کو ضروری سمجھنا میری رائے میں غلطی ہے۔ جو کچھ ملائے کہتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ انسان فائدہ کی تکلیف محسوس کر سکے۔ چنانچہ ہر شخص کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی طرح ایک آدھ وقت کا فائدہ کر لیتا ہے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ آدمی فائدہ کی اذیت محسوس کرنے کے بعد اپنا مال فائدہ کرنے والوں کے حوالے کر دے۔ یہ یقیناً اس رائے سے متفق نہیں ہوں کہ میرا بچہ محض تمہاری عقلمندی سے یہ مصیبت بچھٹے۔ علاوہ ازیں یہ روزہ کی شادی کیسی کہ تم بہانہ جمع کرنے کی فکر کر رہے ہو۔ بہت سے کام ہیں جہاں روپیہ مناسب طور پر صرف ہو سکتا ہے۔ روپیہ اس واسطے نہیں ہے کہ اُٹنے آکر مرے اڑائیں اور میرا بچہ روزہ کی مصیبت بچھٹے۔“

حسن۔ ”کس قدر افسوس ہے تمہاری عقل پر کہ تم نے بالکل ہی غریب کو کھو دیا۔ اور ایسے ایسے سخت کلمے تمہاری زبان سے نکلتے ہیں۔ تم اگر اپنے تئیں مسلمان کہتی ہو تو تم کو شرم آنی چاہیے کہ تم اسلام کی اس طرح اپنے منہ سے توہین کرو۔“

نشاہدہ۔ ”میں بیشک مسلمان ہوں۔ اور تم سے بہتر فرق اتنا ہے تم نے اسلام کو نہیں سمجھا میں نے سمجھ لیا۔“

حسن۔ ”اگر تعلیم کا یہ ہی منشا رہے کہ آدمی غریب چھوڑ دے تو میں کہتا ہوں تعلیم گناہ سخت گناہ۔“

شاہدہ - "اگر نازیب کے یہ ہی معنی ہیں جو تم سمجھ رہے ہو تو تم کو تمہارے نازیب کو تمہارے خدا کو سب کو سلام"۔

حسن - "اس قسم کی لغو باتیں تم کو ایک دفعہ پورا مزہ چکھا چکی ہیں۔ اور ابھی تک نافرمانی اور خود رانی کی گفتگو کرتی ہو۔ تم کو جو سزا ملی وہ خدا کا غضب تھا جو تمہارے اوپر ٹوٹا"۔

شاہدہ - "مگر تم نے کیا قصور کیا تھا؟

حسن - "چنے کے ساتھ گھن پس گیا۔ تمہاری وجہ سے میں بھی لپیٹ میں آیا۔

شاہدہ - "اور تمہاری ماں کی موت کون سے خدا کا عذاب تھا؟

حسن - "وہ تو وقت سے مریم اپنی عمر سے مریم اپنے ٹھکانے پر مریم"۔

شاہدہ - "مگر جاہل عورتوں کی عمر تو زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی عمر ایسی نو نہ تھی"۔

حسن نے بیوی کے اس فقرے کا کچھ جواب نہ دیا۔ مگر اس کی طبیعت بگڑ

گئی۔ اس کو مری ہوئی ماں کے متعلق یہ الفاظ بہت ناگوار ہوئے۔ دو تین لمحہ خاموشی

رہی۔ اس کے بعد شاہدہ نے کہا:-

"اگر روزہ ضروری ہے تو یہ شادی کیا معنی رکھتی ہے۔ روپیہ صرف کرنا

کوئی قدم ضرورت نہیں ہے۔ ہم جو دن رات ان رسموں کو پیٹ رہے ہیں تو اسی

واسطے کہ مسلمان تباہ و برباد ہو چکے۔ اب ان کے پاس کچھ نہیں۔ ہاں یہ رسمیں باقی رہ

گئیں جو ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑی ہیں۔ اور جہالت کے کھلے ہوئے کرشمے ہیں۔

کون ایسا آنکھوں کا اندھا ہوگا جو اتنی بات نہ سمجھ سکے کہ جس قدم میں فلاس کی چاروں

طرف پیکار ہو رہی ہو۔ وہ ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ روزہ کی شادی پر اٹھارے۔ دسے

ہیں یتیم خانے ہیں انہیں ہیں ان کو تو قدم کو کچھ فائدہ پہنچے۔ مسلمان مصیبتوں سے

رہائی پائیں۔ نہ کہ یہ غصہ سب کہ روزہ کی شادی ہو۔ یہاں کھاتے پیتے اگر جمع ہوں۔ کوئی

برائی مانگے اور کوئی تشنیں۔ کیا اس سے زیادہ کوئی گناہ ہوگا۔ اور اسکی باز پرس خدا کے ہاں نہوگی۔ یہ اماں جان برابر بیٹھی ہیں۔ اور خدا و رسولؐ کو جانتی اور پہچانتی ہیں۔ خدا کی عطا کردہ ذرا سمجھ کو جواب دیں۔ یہ بتائیں تم بتاؤ۔ ماشارا لندرونوں ایک سے ایک افضل ہیں۔ کوئی تو اس عقدے کو حل کر دے۔ یہ شادی اچھی یا قدم کی بربادی کا خیال اچھا؟

مال۔ ”تمہارا خیال بظاہر درست، اور تمہاری رائے دیکھنے کو معقول اور ماننے کو نہایت اچھی ہے۔ اور ہم بھی اس رائے کی تائید، اور اس خیال کی درستی سے متفق ہیں۔ بیشک ہیں اور ضرور ہیں۔ مگر تمہارے خیال میں کچھ بحث کی ضرورت اور غور کے اختلاف کی حاجت ہے۔ بشرطیکہ ناگوار نہ ہو، اور برائے مانو۔

ہم کو تم سے اس معاملہ میں اتفاق ہے کہ ان رسوم نے جو دوسروں سے لی گئیں یقیناً مسلمانوں کو تباہ کیا۔ بلکہ ہم یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ عام طور پر مسلمانوں کا بڑا حصہ رسوم کی بدولت پریشان ہوا۔ مگر اس سلسلہ میں سب سے پہلے رسم کی نوعیت اور ادا کرنے والے کی حالت پر غور کرنا ہوگا۔ رسم مفلس سے واسطے رحمت اور مالدار کے لئے رحمت ثابت ہوگی۔ بشرطیکہ اعتدال سے آگے نہ بڑھے۔ انجنوں یتیموں، غریبوں، ابا اچوں کی خدمت سے کس کو انکار ہے۔ مگر سب سے پہلا حق تو ہمارے اوپر ہمارے عزیزوں کا ہے۔ وہ عزیز جن کو روٹی کپڑا کچھ بھی میسر نہیں۔ تمہارے بیٹے اور شمسال میں کیسی کیسی دیکھاری لڑائیں، کیسے کیسے یتیم معصوم بھرے پڑے ہیں۔ کیا تم کہہ سکتی ہو، تمہارے میاں بتا سکتے ہیں کہ رمضان بھر میں کتنی مرتبہ اپنے دسترخوان سے اٹھا کر درویشیاں ان کو ہمدردی، جوان لڑکیاں، محروم و بزرگ، غریب بچے، فاقوں سے سوئیں، اور رنگے پھریں۔ کیا تمہارا دل بد نصیبوں کی مصیبت پر پس بچا؟ اور حاجتمندوں کی حاجت پر کڑھا؟ یہ دیوار بیچ فہمیرا ڈیڑھ سال کی بیٹا ہی راہ بیٹھی ہے۔ ہمارے آنکھوں کے سامنے رنڈا پا کاٹ دیا۔ اور ان میں قنیا۔

تمہارے میاں کی حقیقی خالہ زاد بہن ہے۔ مگر میں جانتی ہوں کہ تمہارے ٹکڑے کی شرمندہ نہیں۔ یہ رسم حقیقت رسم نہیں ہے۔ ایک بہانہ ہے کہ تمام عزیز اقارب ایک جگہ جمع ہو کر ایک گھر میں بیٹھ کر ایک دسترخوان پر کھانا کھالیں۔ اور اس سلسلے میں امیر کے پیسے سے غریب بھی مستفیض ہو جائے۔ کیسی شادی اور کیسا جلدی محبوب حقیقی کا شکر ہے کہ تو نے اس بچے کو اس قابل کیا کہ ہماری زندگی میں یہ تیرے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ اس سرشت میں جو تو نے ہم کو عنایت کی۔ ہم تیرا شکر یہ اس طرح ادا کرتے ہیں کہ اپنے عزیزوں کو جو تیرا حکم ہے۔ تیرے عاجز بندوں کو جو تیرا ارشاد ہے کھانا کھلا کر خوشی کرتے ہیں۔ تاکہ ان کے دکھے ہوئے دل تسک پا کر کھانا کریں۔ تو قبول کرے اور تمہارے بچے کی عمر میں ترقی ہو۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ ضرورت کے موقع پر دو۔ بیٹی کوئی خواہ مخواہ نہیں دیا کرتا۔ دیتے وہاں جہاں اپنا کام ہو یا نام۔ وہ دینے والے کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ قبروں میں جا سوئے۔ اسباب اگر ایسے موجود ہیں تو وہ دیں شوق سے دیں اس سے بہتر کام اور کیا ہوگا۔ مگر اس لئے کہ بیٹے کے روزہ کی شادی ہے بعض اس مانتا ہیں ہر شخص خوشی خوشی روپیہ صرف کر دے گا۔

اسی واسطے یہ سلسلے بڑوں نے مقرر کر دیے۔ اور وہ بھی ان لوگوں کے واسطے جن کے پاس ہے۔ ان کے لئے نہیں کہ گھر میں نہیں کوڑی لگے والے ہوتے۔ قرعہ لیا نام کیا۔ بھیک مانگی، گرو دی رکھا اور شادی بچا بیٹھے۔ ان کے واسطے تو یہ ثواب سخت عذاب ہے۔ وہ رسوم جن میں دوسری القربے کی تعمیل ہو جہاں ایمان۔ وہ رسوم جن میں غوا امیروں سے مستفیذ ہوں لاریب جائز۔ وہ رسم جو ہماری روایات کو زندہ رکھیں، بلا شک درست، خدا نے اپنے فضل و کرم سے تم کو دیا ہے اور ضرورت سے زیادہ۔ یہ ہر شے تمہاری ملکیت نہیں۔ تم لا کہ اپنا مال اور ہزار اپنی

چیز سمجھو۔ مگر اس میں دوسروں کے بھی حقوق اور سب بڑا حق، سب بڑا حصہ، اسی دینے والے کا ہے جو دینے کی قدرت رکھ کر لینے کی طاقت رکھ کر یتیم کی صورت میں تنقیر کی ہیئت میں تمہارے دروازے پر آئے، تمہارے پڑوس میں ہے۔ تمہارے محلہ میں رہے، تمہاری دنیا میں رہے، کیا تم ایمان سے کہہ سکتی ہو کہ تم نے اپنی تمام عمر میں کبھی بھی اس نیت سے، اس خیال سے، اس ارادے سے کسی حاجتمند کی ضرورت کسی بد نصیب کی مصیبت کسی دکھیاہی کا دکھ، دور کیا، پورا کیا، رفع کیا؟ نہیں ہرگز نہیں، کبھی نہیں، قطعی نہیں! پھر تم ہی بتاؤ کہ اگر اسی بہانے دولت نیک لگی، تمہارا بیڑا پار ہوا، تمہاری عاقبت سنور ہو گئی تو اچھا ہوا یا برا؟ میں ان لوگوں کی دشمن ہوں جو خود کسی قابل نہیں۔ مگر مصیبت میں پھنس کر آفت میں گھر کر قرض لیکر رہیں ادا کریں۔ اور اسی طرح ان لوگوں کی بھی جو امداد دیکر دو تہہ بیکر روپیہ رکھ کر ضروری رقم سے بچیں اور روٹی کا ایک ٹکڑا، روپیہ کا ایک پیسہ، ٹھکان کا ایک چھتھڑا، خدا کی راہ پر نہ دیں۔ تمہارے یہ دونوں چھو کر سہ تین سال سے تمہاری غلامی کر رہے ہیں۔ یہ آج بن ماں کے سہی، بن باپ کے سہی۔ مگر کبھی کلیجہ سے ٹکڑے اور آنکھوں کی ٹھنڈے لک بھی نہ گئے۔ اس وقت وہ آنکھیں بند اور وہ کلیجے موجود نہ ہوں۔ مگر یہ مسلمانوں کا اولاد میں تم بنا سکتی ہو کہ اس سوجھ بوجھ سے کتنی مرتبہ ان کو کلیجہ سے لگایا اور کتنے دفعہ گھر کا جھڑکا۔ ڈانٹا پیٹا۔ کیا یہ صرف اسی سے پیدا ہوئے تھے کہ مائی محبت اور باپ کی شفقت سے محروم ہو کر درد کی ٹھوکریں کھائیں؟ کیا انکی عمر اس قابل نہ تھی کہ تم ان کو تعلیم دیتیں۔ اور یہ پڑھ لکھ کر کسی قابل ہوتے؟ ان کی صورت اگر آنکھیں ہوں، ان کی حالت اگر کان ہوں، کچھ دکھاتی ہے، کچھ سناتی ہے، عقل ہوتی ہے کچھ بتاتی ہے۔ اور ایمان ہوتا ہے کچھ طلب کرتی ہے۔ یہ تمہارے کلہرے شرب کیا، تمہارے مذہب کے سامانی، اور تمہاری قوم کے بچے ہیں۔ جو روکھے ٹکڑے کھا کر اونٹ پیچھے پڑے، پن کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

انہوں نے زبان سے نہیں، اپنی حرکات سے، انہوں نے منہ سے نہیں اشارت سے، اپنی کھانم کو سنائی، اپنی مصیبت تم کو بتائی، مگر تمہارا دل نہ پسچا، لیکن اس روزہ کے طفیل تمہارے بچہ کی بدولت اور اس رسم کے صدقہ میں ان کا تن ڈھکے گا اور ان کا پیٹ بھرے گا۔

حسن میاں بچہ کو روزہ رکھواؤ۔ اور گرگڑا کر مجھ کو حقیقی سے التجا کرو کہ وہ اس کی بہار تم کو دیکھنی نصیب کرے۔ اس کی عمر میں برکت دے اور اس کا صدر منگو نہ دکھائے۔ محتاجوں کو کپڑے پہناؤ۔ بھوکوں کو کھانا کھلاؤ۔ روؤ اور گرگڑاؤ کہ اے حاکم حقیقی میری التجا سن۔ اور جو بچہ آج روزے کا دوہا ہے۔ اس کو وہن کا دوہا بتنا نصیب ہو۔

پانچ سوواں باب

شومہر کی بریکاری کا زاہد کا دل پر ایسا کاری زخم اور گہرا صدمہ تھا کہ گویا پ کی طرف سے کم اور مال کی طرف سے کافی۔ ساس کی طرف سے تھوڑی اور خسر کی طرف سے مستحول بدو اس کو بل رہی تھی۔ مگر وہ رعایت مصیبت اور سلوک عذاب سمجھتی تھی۔ مجبور لیتی، اور لاچار صرف کرتی۔ مگر دو چار دفعہ نہیں۔ یہ اس نے بار بار کہا کہ ”میاں کی کمائی کا ایک پیسہ اس ڈھیر سے اور سوکھی روٹی اس قورمہ سے فضل اور بہتر۔“ بیوی کا خیال کسی نہ کسی ذریعہ سے میاں کے کان تک پہنچتا اور یہ کچھ نہیں کہ اس سے متاثر نہ ہوتا۔ اس کی خود رائے یہ ہی تھی۔ اور اچھی طرح سمجھتا کہ بڑھے بپا اور امیر خسر کی کمائی میں خواہ مخواہ سا بچھا لڑانا انتہائے بے جہتتی ہے۔ مگر کڑا کیا ہون دن بھر مارا مارا پھرا، رات بھر نمازیں پڑھیں، مگر روزگار نہ ملا، احسان کی وہ شہیں شاں اور مطلقاً سب پہاڑی تکیا تھی۔ پھر اگر ادھر تو روپیہ کا ٹوٹا، ادھر دوستوں

کے کچوکے، اور سب سے بڑی مصیبت پریشانی، غرض وہ صاحبیت تو پہاڑ سے چلتے ہی چلتے کم ہو گئی رستہ میں اور کبھی جھو جھری ہوئی۔ اور گھر پہنچ کر تو وہی کوہِ احسان تھا۔ مصیبت وہ انکس ہے کہ بڑے بڑے سرکشوں کی گردنیں مڑوڑ کر نیچے جھکا دیں۔ احسان تو کس گنتی میں تھا دو چار دن تو ذرا اکڑا رہا۔ مگر پھر جو جھکا تو یہ حال تھا کہ کسی وقت کی نماز ناغہ نہ کرنا۔ زاهد کا پہلے ہی وظیفہ اور تسبیح کی اتنی دلدراہ تھی کہ بچپن ہی میں کنبہ بھر حجن کھتا تھا۔ اور اب تو یہ حال تھا کہ حصنِ حصین کا ختم یا غفور کی تسبیح یا کریم کا وظیفہ دن رات تھا۔ پہر حال میاں بیوی کی التجا کا اثر تھا یا صرف میاں کی کوشش کا نتیجہ۔ احسان کو ایک جگہ ملی اور اچھی ملی۔ ہم اس موقع پر زاهد کا تشریف جن قدر کریں وہ کم۔ اس نے پہلی تنخواہ ہاتھ میں آتے ہی غراب کو کھانا کھلایا اور تمام عزیز اقارب کو جمع کیا، مولود شریف پر لٹھا۔ اس سلسلہ میں وہ دونوں بھوپھی بھتیجیاں رحیم اور منیر جو شاہراہ کے ہاتھوں حوالات میں پہنچی تھیں جس وقت آئی ہیں اور زاهد کا مہانوں کی چھوڑا ہوا رحیم کو لینے گئی ہے تو ہر تنفس اس کا مارج تھا۔

ذکرِ ولادت کے بعد زاهد نے یہ تقریر کی :-

”بزرگ ماؤں اور عزیز بہنو! آپ نے حضور اکرمؐ کے حالات سن لئے اور دیکھ لیا کہ وہ ذاتِ پاک جو غریبوں کا لجا اور یتیموں کا ماں کی ہے کس طرح دنیا میں رہی۔ اور کیونکر یہاں سے رخصت ہوئی۔ اس پاک زندگی کا ہر واقعہ اور واقعات کا ہر حصہ ہم کو اسلام کے معنی بتا رہا ہے۔ سسرورِ عالم کے بعد خلفائے راشدین کا دور ہم سے آواز بلند کہہ رہا ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ مار پیسہ کو سناٹا دیکر دنیا میں ترقی کی۔ تاریخ سے بڑا شاہد کون ہو گا جس نے ہم کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اسلام کی مغوس گھڑی وہ تھی جب

مسلمان مذہب سے علیحدہ ہوئے۔ مصیبت کی گھٹائیں اسی وقت
سروں پر چھپائیں۔ افلاس کے پٹھے اسی حالت میں تیز اور وقت کے
پہاڑ اسی وقت چاروں طرف سے نمودار ہوئے اور نوبت یہاں
تک پہنچ گئی کہ ہم جو علوم و فنون میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ جاہل
مطلق بن گئے۔ خدا غریقِ رحمت کرے مگر ہمیں کو کہ انہوں نے
برائیدید قوم کی جو عرصہ حیات میں دم توڑ رہی تھی۔ نبض دیکھی۔ اور
مرض پہچانا، ششہ لکھا، اور دوا دی۔ ہم اپنے عروج کو تو کیا پہنچتے۔ مگر
غیرنا سے ہاں ہو گئی۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس جدوجہد کا نتیجہ حسب
توقع خوشگوار نہ نکلا اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مذہب کا لحاظ
کامل طور پر کیا گیا۔ وہ تجویزیں ختم، وہ کوششیں پوری، اور وہ
منصوبہ مکمل ہو چکے۔ اور جن دماغوں میں عقل، جن آنکھوں میں روشنی،
اور جن دلوں میں ایمان موجود ہے ان کو اس امر کا اعتراف ہے کہ
اندھی تقلید اور دوریِ مذہب جو بربادی کا پیش خیمہ تھی ستیا ناس
کر دیا۔ اب ہمارے سامنے تعلیم نسواں کا مسئلہ ہے۔ اور یہ کہنا کہ مسلمان
اس کی اہمیت کو سمجھ گئے غلط ہے۔ آپ کو تعجب ہوگا۔ اگر میں یہ
کہوں کہ مسلمانوں پر یہ حکم ہے کہ وہ تعلیم نسواں کے مخالف تھے۔
مسلمانوں نے تعلیم کے متعلق حضور اکرمؐ کے ارشاد کو ہمیشہ سرائی لکھوں
پر رکھا۔ مگر انہوں نے اس تعلیم کو جو آجکل دی جا رہی ہے۔ تعلیم نہ سمجھا
انہوں نے یہ جان نہ خیال نہ کیا کہ اپنی لڑکیوں کو جن کے جوہر عصمت کے
محالہ میں وہ دنیا کی ہر شے کو بیچ سمجھتے تھے اپنی آنکھ سے ایک
لحہ بھر کے لئے اوجھل کر دیں آج کی دنیا اس کو غلط کہہ دے مگر خیال

یقینی مقبول اور فیصلہ بلا شک صحیح تھا۔ وقت نے ان کو عاجز اور ضرورت نے ان کو لاچار اور زمانہ نے ان کو مجبور کیا۔ دولت ان سے گئی، حکومت ان سے چھٹی، سلطنت ان سے گئی۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اگر ان کو دنیا میں زندہ رہنا ہے۔ تو اپنے گھروں میں بیٹھ کر اپنے کونوں میں دیک کر اپنے کھنڈلوں میں سکڑ کر اپنی آبرو کو دونوں ہاتھوں سے بٹائیں، بڑوں کی عزت کو کلیجہ سے لگائے خاموش بیٹھیں، اور اپنا بھرم کھیں، دولت نہ تھی، عزت تھی راج نہ تھا، لاج تھی۔ حکومت نہ تھی، غیرت تھی۔ سرگئے۔ گراں نہ بگڑنے دی۔ دولت مند بنو! ان کو اپنے نقطہ نظر سے نہ دیکھو۔ تم آٹھ سیر کے آئے، اور آدھ سیر کے گھی میں مگن ہو وہ غریب ۲۰ سیر کے آئے اور ڈیڑھ سیر کے گھی میں بھی شکل سے پیٹ بھرتے تھے۔ تم پر صرف اپنی ذات کے حقوق ہیں۔ ان بے نصیبوں پر غیروں کے بھی تھے۔ تم کھا کر مطمئن اور بہن کر خوش ہوتی ہو تو وہ کھلا کر خوش اور بہن کر بدلتا ہوا ہوتا ہے۔ میں ایسی خوش نصیب نہیں ہوں کہ وہ صورتیں اپنی آنکھ سے دیکھتی۔ مگر ان کے ہر سانس میں ہیں۔ اور ان کے کھڑوں کے دیکھنے کو ترستی ہوں۔ کیا تم اس سفید ڈاڑھی کو قابلِ رحم اور اس پیشانی کو جو گھنٹوں سجدے میں رہی ہو لائق ہمدردی نہیں سمجھتیں جس کا منظر میں تم کو دکھائی ہوں۔

نماز مغرب سے فراغت پا کر بڑے سیاں لکڑی ٹیکتے ہوئے بیوہ پر ڈوسن سکے گھر پہنچے اور پوچھا :-

”بیٹی تیل منگو لیا؟“

بیوہ - ”جی نہیں آپ ہی کی راہ دیکھ رہی تھی۔ ننھا بھی بخار میں
لوٹھ ہے۔ دھیلے کا تیل اور دھیلے کا شربت بنفشہ لا دیجئے۔“
ایک ہاتھ میں ٹوٹی بوتل دوسرے میں پچا کٹورا تیل لائے شربت
لائے۔ بیوہ نے کہا:۔

”اے سہ نانا میں تو جھول گئی ایک پیسہ کے اُپلے بھی لا دیجئے۔“
برٹے میاں - ”اچھا بیٹا لاؤ۔“

رات کا وقت ’سرک پر اندھیرا‘ بخل میں بوجھ۔ ٹھوکر کھائی گرے
اور اُٹھے چاروں طرف ٹٹول کر اُپلے سمیٹے۔ ایمان زبان سے کہتے
ہوئے لرزتا ہے۔ اور تمہارے نازک دل پہ سنگہ کانپ جائیں گے
کہ برٹے میاں نے اس اندھیرے میں اس خیال سے کہ بیوہ کے مال کا
قیامت کے روز مجھ سے مواخذہ نہ ہو۔ ایک ایک کڑی ڈھونڈ ڈھونڈ کر
پُجی اور لے کر آئے تو بیوہ نے اُپلے لیکر کہا ”مکان دار آیا ننھا۔ کراپہ کا
روپیہ میرے پاس کھا ہی میں نے اس وقت بات نہیں کی۔ یہ دیتے جائیے۔“
برٹے میاں - ”تم نے بہت اچھا کیا۔ لاؤ میں دیدوں گا جو
عورت کا غیر مروت سے بات کرنا کیسا۔ بیٹی ہم نے ایک دفعہ مولانا سے
یہ سنا تھا کہ کسی موقع پر حضرت ابی بکرؓ اور بنی بنی عائشہؓ رضی
دونوں باپ بہنیاں باتیں کر رہے تھے۔ کہ رسول اللہ تشریف لے
آئے۔ اور آپ نے اس تنہائی کو پسند نہ فرمایا۔ بھلا خیال تو کو مصدقؓ
جیسا باپ اور صدیقہؓ جیسی بیٹی کہ بیٹی بھی اور مسلمانوں کی ماں بھی۔
جب یہ صورت ہو تو ہم جیسے گنہگار کس گنتی میں۔ بیٹی جہاں دو آدمی
ہوتے ہیں وہاں تیسرا شیطان ضرور ہوتا ہے۔ اور تمہارے حالات کا

تقاضا یہی تھا۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ اُس سے بات نہ کی اس کو نہ
 میں بھی اللہ اللہ کرتی رہو۔ خدا عزت ابرو سے اٹھائے تو سب کچھ بھر پایا۔
 میری بہنو میں تم سے بحث نہیں کرتی۔ میں جانتی ہوں کہ وقت تمہارا
 ساتھ ہو۔ تم جو کچھ بھی کہو گی وہ صحیح۔ اور میں جو کچھ بھی کروں گی وہ غلط۔
 مگر تمہارے ایمان پر فیصلہ چھوڑتی ہوں۔ کیا بڑے میاں کی یہ رائے
 غلط تھی کہ عورت کی عصمت پر تمام خاندان کی عزت
 کا انحصار ہے۔ اگر نہیں تھی اور ان کا خیال درست تھا تو کیا وہ یہ
 کر سکتے تھے کہ اپنی جوان بیٹیوں کو کسی ضرورت سے بھی آنکھوں سے دور کر دیں۔
 تمہارا دعویٰ اب شاید اور بھی مضبوط ہو جائے۔ اور تم کہہ سکو کہ
 عصمت لائق تھوڑی پھر رہی۔۔۔ کیا ڈاکے پر ڈبے ہیں کہ لڑکیوں کو
 قید کر دو۔ بہنوں تم اس کو قید نہ کہو۔ یہ صرف احتیاط تھی۔ اپنا واسطے
 نہیں لڑکیوں کی واسطے کہ وہ ہر بلا سے محفوظ اور ہر آفت سے بچی رہیں۔
 میں خود کہتی ہوں کہ ڈاکہ نہیں پڑ رہا۔ اور خدا نخواستہ تم سے بھی بظن نیکی
 کوئی وجہ نہیں ظنوا المؤمنین خیراً میرا ایمان ہے۔ لیکن امکان
 پر غور کرو آخر پچھلے ہی مہینہ کا واقعہ مشن کالے لوہے کس طرح ماں
 باپ چیتے اور پیٹنے پھرے۔ بڑھے باپ نے کیا کیا نہ کیا اور اس
 بڑھاپے نے اس کو کیا کیا نہ دکھایا۔ چھوٹی آنکھ کا دیدہ، عمر بھر کی کئی
 ایک بچی اور وہ آنکھوں کے سامنے غیروں کے پھندے ہیں جنہیں جانے
 پڑی صید باپ پر کیا گزری وہی بتا سکتا ہے۔ رسول کے آگے ہاتھ
 اس نے جوڑے۔ عدالت کے پاؤں میں سر اس نے رکھا بیٹی کی
 منت خوشامد اس نے کی۔ مگر ڈاکا اثر نہ ہوا۔ جوان تھی کھلم کھلا بیسی

ہوئی۔ اور وہی شخص چار برس کو سارا محلہ جانتا تھا عیسائی ہو کر اس کا
 شوہر بنا۔ قاضی اور ملا، کچہری اور عدالت کوئی بھی کچھ نہ کر سکا کہ لڑکی اپنی
 مرضی کی مختار ہے۔ میں تم سے پوچھتی ہوں کہ اگر وہاں باپ مشن میں آزادانہ
 نہ بھیجتے تو یہ دن بیوں دیکھنا نصیب ہوتا۔ اس سے نہیں انکار
 نہیں اور ہو سکتا بھی نہیں کہ مشن سکولوں کی تعلیم میں اندیشے کا
 امکان ہے۔ ایسی حالت میں وہ لوگ قبرستی سے چونکہ عصمت کو
 عورت کا سب سے بڑا جوہر سمجھتے تھے۔ انہوں نے موجودہ ذرائع تعلیم
 قابل اطمینان نہ سمجھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا لایا کہ وہ تعلیم نسواں کے
 مخالف ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں۔ بلکہ اصلیت وہ احتیاط ہے
 جو میں نے بیان کی۔ اب تم کو پھر ایک بات کہنے کا موقع ملتا ہے کہ
 حصول علم اسلام کا مسئلہ فیصلہ ہے۔ جس میں مرد کی تخصیص نہ عورت
 کی انہوں نے محض اپنے دہم پر عورت کی تمام زندگی قربان کر دی۔
 اور اس کو جاہل رکھ کر قوم کو وہ نقصان پہنچایا۔ جس کی تلافی صدیاں
 بھی مشکل سے کریں گی۔

مجھے اعتراض کے پہلے حصے سے اتفاق ہے۔ اور میں اعتراف کرتی
 ہوں کہ تحصیل علم کی کوشش اسلام کا فیصلہ قطعی ہے۔ مگر میں
 اس کے ساتھ اتنا ضرور کہوں گی کہ اسی وقت تک اسی حال میں
 اور اسی صورت میں کہ ہمارے مذہب پر آنچ نہ آئے۔ جب ہمارے
 مذہب پر زہرت آئی تو ہم وہ لوگ ہیں کہ علم کیا تو بہ تو بہ نحو ذوالعہدہ.....
 خیر میں سمجھ اور تو نہیں کہتی۔ اپنی زندگیوں تک کو قربان کر دیں۔
 مسلمانوں نے اگر تعلیم نسواں کو مذہب پر قربان کیا تو کیا گناہ کیا۔ وہ

دیکھتے تھے کہ مسلمانوں کے اتنے مدرسے موجود نہیں، اتنی
اُستادیاں بیسر نہیں، اتنے انتظام ممکن نہیں، وہ سنتے تھے
کہ مشن کی پڑھنے والیاں اذان کے وقت انجیل کے سبق رٹ
رہی ہیں۔ وہ دیکھتے تھے، اور سنتے تھے، وہ جانتے تھے ان کو
معلوم تھا کہ مؤذن کے الفاظ ہوا میں گونج رہے ہیں۔ اور
نہند کے متوالوں کو جگا جگا کر حق کی طرف ہمارے ہیں مگر کوارسی
بچیاں جہان اور ہوشیار نیکیہ کے نیچے سے انجیل نکال کر جھپٹا
حفظ کر رہی ہیں۔

وہ جانتے تھے کہ یہ ان مرنے والوں کی بچیاں ہیں جن کے کلیجے
پیغام حق درہلا دیتا تھا کلمہ پڑھ کر اٹھ بیٹھتی تھیں۔ اور کڑکڑاتے
جاذبوں میں وضو کر کے سجدوں میں گر گڑا، گر گڑا کر حکم الحاکمین کی
وصایت کا اعتراف کرتی تھیں۔

میری بچیو! کوارسی بیٹی کو دلہن بنا کر پاکی میں بٹھا دو۔ دواغ کو دو
میت کو نہلا دھلا چار پائی پر لٹا کر رخصت کر دو۔ مگر دواغ مذہب
آسان کام نہیں۔ جو لوگ اس کو جدا کر رہے ہیں۔ ان کو محاذِ نہ ہر
مگر ان کی حالت پر ابھی رونے والی آنکھیں دنیا میں موجود ہیں۔ یہ
دو چیزیں عصمت اور مذہب مسلمانوں کے سامنے تھیں۔ اور ہیں۔
ترازو کا ایک پلڑا یہ تھا اور دوسرا تعلیم نسواں۔ واقعات تمہارے
سامنے ہیں۔ ترازو اپنے ہاتھ میں ہے۔ لو اور بتا دو کہ کدھر کا پلڑا
وزنی ہے۔ اور بڑے میاں کیا کریں۔

یہ میں نے منوا دیا۔ مگر واقعہ جو تم سمجھ رہی ہو وہ نہیں انہوں نے

تعلیم نسواں کو ہرگز نہیں چھوڑا۔ وہ صرف اسی تعلیم کے مخالف تھے جو ان کے اصولوں سے علیحدہ تھی۔ وہ پڑھاتے تھے لکھاتے تھے اور بتاتے تھے کہ دنیا میں کیونکر رہنا ادا کیا کرنا ہے۔ میری بہنو! ان کا ہر گھر کتب اور ہر محلہ مدرسہ تھا۔ یہ مبالغہ نہیں ہر پڑھی لکھی عورت کا فرض تھا کہ محلہ کے بچوں کو پڑھائے۔ اب وہ سماں نہ رہا مگر اسکے دیکھنے والے موجود ہیں کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں بغل میں تکیہ اور پارے لئے علی الصبح استنانی کے یہاں پہنچ گئیں۔ یہ اپنا ہی محلہ اور دیوار بچ گھر ہے۔ مائیں آ اور جا رہی ہیں، دیکھ اور بھال رہی ہیں کہ تعلیم کیوں کر ہو رہی ہے۔ پڑھنا، لکھنا، سینا پر دنا، کھانا پکانا جہاں چاہیں نہیں آسکتا وہاں باتوں باتوں میں حائل ہوتا تھا۔ تم مشکل سے اور شاید دس پانچ منٹ میں کاغذ اور قلم پینسل اور سلیٹ پر لکھ کر بتاؤ گی مگر وہ تمہارے سامنے زبانی حساب کر کے بتا دیں گی کہ دو روپے ساڑھے چھ آنے گز کا کپڑا ایک گز ساڑھے سات گرہ کتنے کا ہوا۔ تم کو سوچنا پڑے گا کہ بونے چودہ چھٹانک کا گھی سات پیسے کا کتنا ہوا۔ مگر وہ چٹکی بجاتے ہی بتا دیں گی۔ اگر تم کو تعجب ہو تو میری نانی اماں بھی ہیں ان کا امتحان لے لو۔

تو بہنو! انہوں نے ہرگز ہرگز تعلیم نسواں کو ہاتھ سے نہ دیا۔ تعلیم دی اور وہ تعلیم جو اسلام کا عین منشا تھا۔ خیالات پلٹنے نہ دئے۔ مذہب کو مقدم رکھ کر ہر ضرورت کو اس کے تحت میں سمجھا۔ اب بھی مسلمان لڑکیوں کو تعلیم دے رہے ہیں۔ اور پہلے بھی دیتے تھے۔ مگر اس طرح کہ مذہب ہاتھ سے نہ جائے مسلمان بیبیوں کا

وہ فریق پادروں کا وہ گروہ جو تعلیم جدید کو مقدم سمجھ رہا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ زمانہ کی رفتار اس کے ساتھ ہے۔ وہ جو کہے درست مگر حق یہ ہے کہ ان کو علم صرف اتنا ہی حاصل ہوگا کہ ٹوٹا پھوٹا خط لکھ لیں۔ یا اعلیٰ لباس پہن کر تفریح کر لیں۔ بہت تیرا تیرا تو کسی شہر کا نام انگریزی میں لکھ لیا۔ مگر یہ جو کچھ اس طریقہ تعلیم سے (مشن سکولوں میں پڑھنے سے) حاصل ہوگا اس زبردست قربانی کے بعد جس کا نام مذہب ہے۔

تقریر ختم کرتے ہی زاہد آگے بڑھی۔ ایک کشتی اٹھائی جس میں دو نئے جوڑے اور کچھ روپے تھے رحیم کے پاس آئی اور کہا:-
"میں ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ خدا را شناہوں! یہ نصیب کا قصور سہا کیجئے۔ یہ صرف آپ کی آہ کا اثر ہے کہ وہ سمجھت آج تک نہ پہنچی۔
رحیم نے زاہد کو گلے لگا لیا اور کہا:-

میں ایک معمولی ماں ہوں۔ اس قابل نہیں کہ آپ مجھ کو اس طرح شرمندہ کریں۔ بچی خدا تیری عمر دلا کرے۔ تیرا گھر آباد اور تیری ما کا کلیجہ ٹھنڈا رکھے۔ چھوٹی بیوی کا نام میرے سامنے نہ لو۔ میری آبروان کی بدولت غارت ہو چکی۔ اور آج تک میری بچی کو بڑبڑا۔ میں جیل خانہ پہنچی اور حوالات میں ہی۔ بیوی اس سے زیادہ صیبت کیا ہوگی۔ رات کے وقت میری کواری بچی میری آنکھ سے اچھل ہوئی۔ میں اپنا کلیجہ مسس کر رہ گئی۔ وہ طاقتور ہیں، امیر ہیں، پڑھی لکھی ہیں۔ میں بیچاری کمزور ہوں، غریب ہوں، بدلے کے لائق نہیں۔ مگر جس کے آگے پانچ وقت سر جھکاؤ ہوں۔ وہ شناہوں! بیوی سے زیادہ طاقتور ہے۔ میرا بدلہ ضرور لے گا۔"

اتنا کہ رحیم کی طبیعت بگڑ گئی۔ اس کی آنکھ سے آنسو نکل پڑے۔ کھڑی ہو گئی

ہر چند سب نے روکا۔ مگر اس کی حالت ایسی خراب ہوئی کہ وہ نہ ٹھہری اور چل دی۔
شام کے وقت وہاں اپنے اپنے گھر رخصت ہوئے۔ دوسرے روز صبح کے
وقت جب زاہد کا میاں کو کھانا کھلا چکی تو پندرہ روپے دے کر کہا:-
”آج ہی دہن بیگم کو روانہ کر دو۔“

احسان:- ”نہیں، ہرگز نہیں۔“

زاہد:- ”نہیں یہ فیصلہ غلط ہے۔ وہ نکاح میں ہیں اور ان کی خبر گیری
تمہارا فرض ہے۔ دنیا کے دھندے چل رہے ہیں، چلے جائیں گے۔ مگر خدا کے
ہاں بوجھ اپنے سر پر نہ رکھو۔“

احسان بیوی کی انسانیت کا مستحق پہاڑ پر ہوجکا تھا۔ یہاں پہنچ کر جب یہ
دیکھا کہ زاہد کا ملازمت سے زیادہ بیکاری میں فرمانبردار نکلی تو اس کا کلمہ پڑھنے لگا۔
اس وقت زاہد کا نے یہ تقریر کی تو ان تمام مظالم کی تصویر جو احسان نے پہاڑ پر ٹوڑ
آنکھ کے سامنے پھر گئی۔ اور اُس نے سوچا کہ انتہائے انسانیت ہے اور صرف
جوہر قدامت کہ جس شقی القلب عورت کے ہاتھوں اس غریب پر یہ کچھ گزر گئی
چو رہی۔ مگر ٹھہری۔ گھر چھوڑا۔ بار چھوڑا۔ اس وقت بھی اس کی سفارش کر رہی ہو۔
یہ خیال آتے ہی میاں ختم احسان چنچ اٹھا کہ ”بیشک زندگی تم ہی جیسی بیویوں سے
سنو سکتی ہے۔ جنہوں نے انسانی ہئیت میں شوہروں کو جنت کا نمونہ دکھایا۔“

احسان کی حالت کا انقلاب عارضی تھا۔ جو بیوی نے چند ہی روز میں درست
کر دیا۔ اور وہ شخص جو پہاڑ پر صرف دنیا ہی کو زندگی سمجھتا تھا بیوی کے طفیل متاثر ہو گیا
ہوا کہ گھر سے دفتر تک جاتا تو درود شریف پڑھتا ہوا۔ دل میں خلوص اور نیت نیک
تھی۔ خدا کی رحمت نازل ہوئی۔ اور کچھ نہ پایا وہ موت نہ گذری تھی کہ احسان متلو
روپے ماہوار پر پہنچ گیا۔

تیسواں باب

سنا ہے کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ حسن جیسا عاشق زار شوہر اور غمخوار رفیق جو قدموں کے نیچے آنکھیں بچھاتا شاہنشاہ سے ایسا بیزار ہوا کہ صورتِ مہر معلوم ہونے لگی۔ بچہ جو آنکھوں کا تارا، اور کلچے کا ٹکڑا، غصا غیروں کی مانند لگ تھلگ تڑا اور دشمنوں کی طرح گھورتا۔ باپ جو صورت کا عاشق اور نام کا دیوانہ تھا مہینوں آکر نہ جھانکتا۔ حسن شرفِ شرع تو بیوی سے دو قدم آگے ہی تھا۔ اگر وہ ترقی کی دلدل تھی تو یہ پردے کا دشمن۔ مگر واقعات نے بتا اور حالات نے سمجھا دیا کہ یہ جدت کا دور دیکھنے میں شہر۔ مگر اندر سے زہر ملا ہل ہے۔ طبیعت ہٹی خیال پلٹا، راستے بدلی، ادھر ہر جھکا تو ساس اور سالی دونوں کی زندگیاں جنت تھیں۔ برکت تھی۔ پنہ لگ اور سراغ مل گیا۔ کہ قدامت کہنے کو جہالت، مگر درحقیقت امت ہے۔ اور یہ ترقی کے نعرے دیکھنے میں پیارے ہوں۔ مگر آگ کے شرارے ہیں۔ ترقی اگر ممکن ہو تو صرف مذہب کے ساتھ اور مذہب ان جالوں کا مجھ جیسے پرھے لکھوں سے بدیں اعتبار بہتر کہ ملیگا تو غریبوں میں رہے گا تو مفلسوں میں اور ختم ہو گا تو ان ہی بیچاروں پر۔

خدا کی قدرت تھی کہ وہی حسن جو ترقی کے نعرے لگاتا چاروں طرف پھرتا تھا جس کی تحریر اور تقریر جس کا گھر اور بار جس کی بیوی اور بچے جدت کا کمل وعظ جس کی زبان سے (قلم کے سوا) کبھی خدا کا نام نہ نکلا۔ اس خشوع اور خضوع سے نماز پڑھتا کہ دیکھنے والے تعجب کرتے۔ شاہنشاہ اس کی نماز پر اس کی دعا پر ہنستی۔ مسکراتی، تعجب کرتی۔ وہ دل ہی دل میں دانت پستیا تیر سی چڑھاتا۔ دیکھتا جھوٹا اور سستنا ج کہا جاتا۔ مگر زبان سے ایک حرف نہ کہتا۔ اتفاق دیکھو کہ کلب کا ہوا سا جلسہ دور دور سے آئیں عورتیں۔ دھواں دھار ہوئیں تھریں۔ اور صدر جلسہ نے اپنی

چھپی ہوئی تقریر اس طرح پڑھی جس کا مفہوم یہ تھا :-

”ہمارا چالانت کا زمانہ ختم ہوا۔ ہم میں جو چند پرانی عورتیں زندہ ہیں وہ چند روز کی مہمان ہیں۔ یہ حیثیت مسلمان ہونے کے ہمارا اب فرض ہے کہ وہ کوشش کریں جو ہماری لڑکیوں کو تعلیم یافتہ بنادے۔“

اتفاق کی بات ہے کہ بہن کے پیرا صرار سے اس جلسہ میں زاہدہ بھی چلی گئی تھی۔ اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ اس کا پہلا اتفاق تھا۔ ورنہ وہ کہاں اور اس قسم کے جلسے کہاں۔ سرمنڈاتے ہی اویے پڑے۔ پہلی ہی شرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے فرحت کے کلفت ہوئی۔ تقریر سننے ہی بدن میں آگ لگ گئی۔ بھری ٹیپی تھی۔ کہ گیار کی شامت آئی۔ اور شہر کی طرف رخ کیا۔ شاہدہ جو اس وقت پورے زوروں پر تھیں اور ایک سے ایک بڑھے بڑھے حمایتی موجود تھے۔ بہن سے کہنے لگی :-

”آپ کیوں خاموش ہو گئیں۔ کچھ فرمانا ہے تو فرمائیے۔“

”ممدار چلے۔“ ہاں ضرور ضرور ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے زیر خیالات سے مستفید ہوں۔“

دوسری لڑکیاں۔ ”بیشک بیشک محترمہ ضرور ارشاد ہو آپ کی

بہت تعریف سنی ہے۔“

شاہدہ۔ ”آپ سب بیویاں خاموش ہو جائیں۔ میری ہنسیرہ محترمہ

مسرا احسان کچھ فرمانا چاہتی ہیں۔“

بیویاں خاموش ہو گئیں۔ اور سب کی شرما شرمی زاہدہ کھڑی ہوئی اور کہا :-

بہنو! مجھے آج آپ کے جلسہ میں شریک ہو کر خوشی بھی ہوئی

اور سچ بھی۔ خوشی اس بات کی کہ بہنوں میں اپنی حالت کی بہتری کا احساس

شرع ہے۔ اور امید ہے کہ وہ رفتہ رفتہ بہت کچھ ترقی کریں گی اور
افسوس اس امر کا جہاں صدر جلسہ کی تہذیب یہ ہو کہ تانیوں اور دایوں کو
جاہل کہنے میں بھی باک نہ ہو وہاں حاضرین تو باوا آدم اور اماں خوا
کو جو کچھ بھی نہ کہیں وہ بخوڑا۔

میں اس وقت کسی تقریر کے واسطے تیار نہیں ہوں۔ اور اس لئے
اگر کین جلسہ کی طرح میرے پاس کوئی لکھی ہوئی تقریر موجود نہیں
جو میں طوطے کی طرح رٹ کر آپ کے روبرو پڑھ دوں۔ میں جلسہ
کی صدر صاحبہ سے کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔

بڑی بوڑھیوں کو جاہل کہہ دینا صرف زبان کا ایک سکندر کا کام ہے
اس میں ہلکی گنتی ہے نہ پھنکری۔ جو لوگ خدا کے منکر ہیں ان کو
بھی یہ کہنے میں کہ خدا کوئی نہیں کچھ زیادہ سامان کی ضرورت نہیں
ہوتی۔ صدر صاحبہ نے نہایت اطمینان سے پرانی عورتوں کو جہلا میں
شامل کر دیا۔ میں اس سے پہلے بھی یہ افواجہ بعض لڑکیوں سوسن چکی
ہوں۔ مگر بحث یہ ہے کہ کیا زبان سے کسی کو کچھ کہہ دینا کافی ہو سکتا ہے؟
اگر میں اس وقت یہ کہوں کہ میں عورت نہیں مرد ہوں تو کیا یہ میرا
کہنا صحیح ہوگا؟

عورتیت یہ ہے کہ ہر دعوے کے ساتھ ثبوت ہو۔ زیادہ سے
زیادہ اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہالت کا ثبوت اس سے
زیادہ کیا ہوگا کہ ان کے عقیدے درست نہ تھے، وہ تعویذ گندے
ٹوٹے ٹوٹکوں وغیرہ کی قابیل تھیں، وہ بھی تھیں۔ بہت سی کمزور
باتیں ان کے ٹھکانوں میں شامل تھیں۔ مگر میں کہتی ہوں یہ صحیح نہیں

مجھے اس سے انکار نہیں کہ وہ دہی تھیں۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ انکے بعض عقیدے کمزور تھے مثلاً انکو دم تھا کہ سینڈا جس بچے کے نکل رہی ہو۔ اسکے پاس دھوبن نہ آئے۔ یا بچے کے پاس دھوبن نہ آ سکے ورنہ بہت برا۔ یہ پاس قسم کی اور باتیں ہیں جو ثبوت میں پیش ہو سکتی ہیں مگر کیسے انوں کی بات ہو کہ دیدہ دانستہ جان بوجھ کر انصاف کی آنکھوں پر مٹ دھری کی پٹی باندھی جاتی ہو۔ پھولوں کو کاٹنے اور مٹیوں کو پتھر ثابت کیا جا رہا ہو۔ کیا کوئی ذی عقل اس سے انکار کر سکتا ہو کہ مانسا کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی شے وقعت رکھتی ہو۔ ایک بچہ کو چپک نکل رہی ہو۔ اں رات دن اسکو گود میں لئے رہتی ہو۔ اگر اس کو یہ یقین دلایا کہ دھوبن کا آنا بچہ کیلئے مضرب ہے تو وہ زبردست احتیاط اور رک تھام کی گئی۔ جس کا عشر عشر بھی آج نہیں ہوتا۔ بچہ چپک میں ہے۔ اں معمولی مرض میں گرفتار نہیں۔ مرض متحدی ہو۔ اور بہت ممکن ہوں پر بھی اثر ہو گیا ہو۔ قوی شبہ ہے کہ گھر کے کپڑوں میں اثر موجود ہو۔ اگر یہ کپڑے دھوبن کو دیئے گئے اور اس ذریعہ سے جراثیم ان تمام کپڑوں میں پہنچ گئے جو دھوبن کے ہاں موجود ہیں تو تمام شہر اسی مرض میں گرفتار ہو جائیگا۔ بناؤ یہ ہبات تھے یا علمیت کیسی اچھی طرح ایک بات بتا دی۔ ان کے ذہن میں تو یہ باتیں بطور عقیدہ سے ہوتی تھیں۔ مگر ان تمام باتوں کی علمیت پر جو کہ تو نے اچھی طرح سمجھ لیا سکتی ہیں یہ ہی کیفیت نہ چھ اور بچہ کی ہے۔ دھوبن کے یہاں کسی ایسے نتیجے کو گھر سے کپڑے آئے جہاں مرض متحدی ہے تو اس کو زچہ بچہ کے پاس نہ آنا چاہیے۔ بچہ یا بچہ ہے اور بہت جلد اثر قبول کر لے گا جس بات کو تمہارا جی چاہئے ہے۔ لو، جہالت نہیں پوری علمیت ثابت ہو گی اور حرج

علوم کا تم نے فقط نام ہی سنا ہے وہ اس طرح ان سے ماہر ہوتی
 تھیں تم کہتی ہو گی کہ یہ باتیں ان کی گھنٹی میں اس طرح پر گئی تھیں کہ وہ اس کی
 اصلیت کو بلا سوچے سمجھے پتھر کی لکیر سمجھتی تھیں۔ تمہارا یہ کہنا غلط ہو گا
 معمولی عورتوں کی تو کہتی نہیں۔ مگر شریف خاندان کی خواتین ان گروں سے
 اچھی طرح آشنا تھیں۔ رہے گندے تعینداس کا مجھے اعتراف ہے کہ
 یہ رغبت ان میں نسبتاً زیادہ تھی۔ لیکن اس کو میں جاہلیت سے منسوب
 نہیں کر سکتی۔ اور یہ کہوں گی کہ دنیا سے ناپائدار خدا کے خاص بندوں
 سے کبھی خالی نہ رہی۔ اور تاریخ مسلمانوں میں ان پاک نفوس کا وجود
 ثابت کر رہی ہے۔ جن سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ ان کی التجاؤں کا بارگاہ
 صمدی میں قبول ہونا زیادہ ممکن ہو۔ یہ ہی ہر وہ رجوع جبکہ تم گندے
 تعویذوں سے تعبیر کر لو۔ مگر یہ سن لو کہ زمانہ کی موجودہ ترقی کے ساتھ ہی آپ
 لوگوں کی تعداد بھی بڑھی۔ جو حقیقت کچھ نہ تھی۔ مگر وہ دنیا کے سامنے
 اس لباس میں جلوہ گر ہو گئے۔ اس دورِ جدید کے ایک اعتراف کا جواب
 میرے پاس ہیں کہ مذہب ہی جہالت ہے۔ یہ آپ زبان کو نہ فرمائیں مگر واقعتاً
 آپ کے اس خیال کی تائید کر رہے ہیں۔ اگر مذہب کا نام جہالت ہو تو یہ جہالت
 انہیں ضرور جوڑتی۔ غالباً ترقی سے آپ کا مقصود یہی ہے کہ جہالت یعنی
 مذہب بتدریج کم ہوا میں آپ کو غرور کا میاں بنی ہوئی اور مذہب کی عظمت
 روز بروز گھروں سے اُٹھ رہی ہو جاہلوں کا یقین یہ تھا کہ جس گھر میں بارہ برس
 کی لڑکی بے نمازن ہو وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔
 اگر صبح اٹھ کر نماز سے فارغ ہو کلام اللہ پڑھا جائے تو دن بھر خوشی کی گنتا ہے۔
 رات کو سوئے وقت بچھو لو اس میں لیٹ کر کلام اللہ پڑھ کر گروں کو

پہنچاؤ کہ ان کو ثواب ملے اور عذاب میں تخفیف ہو۔
دسترخان سے اگر کسی غریب مسکین کو کھانا چلا گیا تو کھانے کا حساب ہو
وعظ اور ذکر و ملاقات گھر میں اکثر ہونا چاہیے۔
بارہ برس تک کے بچے اگر بغیر نانا یا ککے مر گئے تو ان کا عذاباں باپ پر ہوگا۔
رات کو سوئے وقت آیت الکرسی پڑھ کر سوؤ تو ہر قسم کے ڈر اور
خوف سے محفوظ رہو گے۔

شیطان کو رستہ زیادہ اذیت مصدم بچوں کے سجدے سے ہوتی ہے۔
کواری لڑکیوں کو جوان لڑکوں سے ہنس کر بات نہ کرنی چاہیے۔
سفیر بالوں کا ادب کرو۔ ان کی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔
بڑا نالہ کھاؤ۔ بڑا بول نہ بولو۔ یعنی غور نہ کرو۔
بچہ کو گود میں اٹھاؤ تو ہم اللہ کہہ کر ناکہ یہ آواز اس کے کانوں میں پڑے۔
دروہ و نصریف گھر میں پڑھنے سے برکت ہوتی ہے۔

غالباً جہالت سے آپ کا مقصد یہ عقائد ہیں۔ اور مجھ کو یہ حق حاصل ہے
کہ میں آپ کو مبارکباد دوں کہ آپ کی کوشش کامیاب ہوئی اور یہ جہالت
اب بہت کم ہو گئی۔ یہ آوازیں اب مسلمان بہت کم سنتے ہیں۔ جاہل ہر یوں
کے عقائد کا انحصار اس شخص کے الفاظ اور ارشاد پر تھا جو خاک عرب سے
اُٹھ کر تمام رتے زمین پر ڈھکا گیا۔ اور فرمایا جو مخلوق کے نزدیک اچھا،
وہ خدا کے نزدیک بھی اچھا۔ اور جو مخلوق سے برا ہو وہ خدا سے بھی برا۔ ان کی کوشش
یہ تھی کہ مرنے کے بعد جن لوگوں سے زندگی میں سابقہ پڑا ہے وہ انکی موت
پر روئیں۔ مجھے صاف کرنا اگر میں کہوں کہ تعلیم یافتہ بیویوں کے کارنامے انکی
زندگی میں اخباروں اور رسائل میں چھپتے تو دانتی ہیں لیکن ان کو

رونے والے غیروں میں کیا اپنوں میں بھی نہیں کیونکہ ان کے وجود سے حقیقی
 مسرت کسی تنفس کو نہیں پہنچتی۔ مجھ کو اپنی بڑی نانی آیا دیں مین میں
 سال کی تھی اور جو منظر اس وقت میری آنکھوں نے دیکھا عمر بھر یاد رکھوں گی
 رات کو تین بچے انہوں نے انتقال کیا اور صبح تک پھر تمام شہر میں شہر
 ہو گئی۔ جنازہ محن میں رکھا تھا کہ محلہ کی غریب عورتیں پیٹ پیٹ کر چنیں
 مارنے لگیں۔ یتیم بچے چار پائی سے پیٹ گئے۔ رات میں قبرستان تک
 بچھاڑیں کھاتی ساتھ بھینس۔ میں بچہ بھتی۔ سمجھ نہ سکی بعد میں معلوم ہوا کہ
 ان میں سے کسی کی تنخواہ مقرر تھی، کسی کا کپڑا، کسی کا کھانا، وہ جاہل بھینس
 مگر ایسی جاہل کہ آج ان کے شاگرد شہر میں ایسے جید حافظ موجود ہیں
 جو ہر سال تراویح میں ان کی جہالت کے کارنامے بلند کر رہے ہیں۔
 شاہد نے تو بہت کوزک دینے کا ایک موقع ملنا تھا۔ مگر انہی ڈانگیں گلے میں لگائیں۔
 زاہد کی تقریر سو مجلس میں ایک سنا چھا گیا۔ دیکھتے ہیں تو رہنماؤں سے مگر بعض رہنماں نے دہن بھر

چوبیسواں باب

اب حسن کی زندگی عجیب زندگی تھی وقت کا بڑا حصہ علماء کی صحبت اور مذہب کی
 خدمت میں بسر ہوتا کرتے کرتے جاڑوں کی ان راتوں میں جب مائیں شاہد کے سر ہاتھ اور
 پائنتی دہتی ہوئی انگلیٹھیاں روشن کرتیں وہ چار بجے اٹھ کر سجدیں آتا۔ اور اپنی پانچ سو نمازیوں کے وضو
 کا پانی گرم کرنا۔ آدمی خوش الحان تھا صبح کی اذان اس جوش و خروش سے دیتا کہ سننے والے تھرا جاتے۔
 اندیشہ نہ یہ تھا کہ شاہد کے لڑکے شاہد کا ماں کے پاس لہ کر اور ہلکی ہٹوتی
 پڑا لکھ کر ناس ہو گا۔ اور وہ باب کو مضبوط الحیر اس سمجھے گا۔ مگر وہ مذہب کے اعتبار سے اس
 وقت کا دوسرا باب تھا۔ تعجب ہونا اور خدا کی قدرت یاد دہانی تھی کہ جس ماں نے سدا کلب

کے کبھی گھر پر خدا کا نام نہ لیا اس کا بچہ اور نگوڑے کی کچھ بساط بھی تو نہیں۔ بارہ برس کی جان اور ایسا مسلمان کہ جیٹھ بیاکھ کے روزے رکھے۔

شاہر کا یہ تو اچھی طرح سمجھتی تھی کہ میاں اور لڑکا دونوں میرے ڈھنگوں سے خوش نہیں۔ مگر وہ دونوں کو جاہل اور بے وقوف جان رہی تھی۔ سچ پوچھو تو اس کے دامن پر ایک ایسا دھبہ تھا کہ وہ بات تک کرنے کا حق نہ رکھتی تھی۔ مگر خدا بے غیرتی کا بھلا کرے۔ کبھی آنکھ جھپٹی نہ دل نادم ہوا۔ اگر کتنی اُسی طرح اور پھلتی اُس سے زیادہ، ہماری رائے میں تو بد نصیب کی برادری کا سارا بار باپ کی گردن پر ہے۔ یہ صحیح کہ وہ خود راہ راست پر آچکا تھا۔ مگر جو بیچ بودے تھے۔ اس کے پھل کیوں کر غارت ہو جائے۔ خدا کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں شاہر کا کی مانند ہی حسن اور شاہر دونوں

کے واسطے "نازیبا نہ ہوئی۔ اور دونوں نے مصمم قصد کیا کہ اپنی زندگی قوم کیواسطے وقف کر دیں اور دنیا کو دکھائیں کہ تعلیم نسواں کیا چیز ہے۔ حسن کے پاس روپے کی کمی نہ تھی۔ اس نے لیم اللہ کہہ کر مدرسہ کھول دیا۔ اور تعلیم شروع کر دی۔ مسلمان اُستانیوں کا ملنا مشکل تھا۔ جو ستر آگئیں ان کو ستر آنکھوں پر رکھا۔ اور جو کمی رہی حسن نے اپنی ذات سے پوری کی۔ انتظام یہ تھا کہ چھ برس سے دس برس تک کی لڑکیاں داخل ہو سکیں۔ حسن ان بچیوں کو خود پڑھاتا، لکھاتا، مذہبی تعلیم ہر لڑکی کے واسطے لازمی تھی۔ اور باقی والدین کی خوشی پر منحصر۔ مدرسہ کا شوق ایسا ہوا کہ حسن بیوی بچے گھر بار سب بھول گیا۔ دن رات وہ تھا۔ اور مدرسہ تھا۔ چند روز میں مدرسہ اس قدر ترقی کر گیا کہ دُور دُور سے لڑکیاں آئیں اور داخل ہوئیں۔ چار سال کے بعد جو لڑکیاں کامیاب ہو کر نکلیں وہ قوم کا مول تھیں۔ علوم جدیدہ کی جہارت کے ساتھ مذہب ان کی رگ رگ میں پیوست تھا۔ اندر کا تمام کام حسن کے سپرد تھا۔ انتظام شاہر کے حسن کی نیت پاک اور کوشش صاف تھی۔ خدا نے برکت دی۔ اور حسن نے دکھا دیا کہ مذہب نظر انداز نہ ہو تو تعلیم نسواں اسلام کا جزو عظیم ہے۔

شاہد اب باپ کا برابر کا بازو کامیابی کا راز اور اس کے تمام مقاصد کی جان تھا۔ اپنی تعلیم سے فارغ ہو کر جو وقت بچتا سب باپ کی کوششوں میں صرف کرتا۔ مدرسہ کا سالانہ امتحان ہوا۔ اس کے وقت اٹھ کر نہ پایا۔ نماز پڑھی۔ مدرسہ میں اتنا بناؤ کیا ہوا؟۔ ہاتھوں کی خاطر ملازمت میں مصروف تھا کہ گردہ میں کسک مچ گئی۔ دوپہر تک ٹانگا اور پھر تاربا۔ مگر ظہر کے بعد تو پھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اپنے چہرے پر ہاتھ لگا کر دیکھا، اور ایک زمین بٹھا بیٹھے سے متنفر اور بیٹھا اس سے بیزار۔ مگر ماضی سننے ہی پاؤں تلے کی زمین بکھل گئی۔ گھر آکر اٹھی اور بیتاب ہو کر رانی دیکھتی ہے تو بچہ کا رنگ سفید پڑا ہے۔ ستائے میں رہ گئی۔ ڈاکٹر حکیم برابر آ اور جارہے تھے۔ منہ پر نچھ اور لپ لپ بدلا جا رہا تھا۔ مگر درد تھا کہ کسی عنوان کم نہ ہوتا تھا۔ درد بچہ کے گردہ میں تھا۔ اوریاں کا کلیجہ نکلا پڑتا تھا۔ اس کے منہ پر منہ رکھتی تھی۔ اس کی مکر کڑی تھی۔ شاہد کی تکلیف جسمانی تھی اور شاہد کی روحانی مگر شاہد کی اذیت بچہ کو کم نہ تھی۔ اس کی چرخش اور راہ کیساتھ بے چین ہوتی۔ دلی ہمتی اور جرات کہتا:۔

”ہائے ماں جان کیا کروں؟“

تو گلے میں ہاتھ ڈال کر لیٹ جاتی۔ دن یوں ہی اور رات ساری اسی رگب و اضطراب میں بسر ہو گئی۔ شہر بھر کے علاج اور دوا بھر کے جتن کر ڈالے مگر درد میں فرق نہ پڑا۔ مجبور ڈاکٹر نے میند کی دوا دی تو ذرا ٹھک لگ گئی۔ شاہد کا روٹھ میں بیٹھی ٹٹکی پاندھے بچے کی صورت دیکھ رہی تھی۔ اور حسن الگ خاموش بیٹھا تھا۔ حسن کا حال جو کچھ بھی ہو مگر شاہد کی کیفیت تو یہ تھی کہ دل اٹا اٹا اور کلیجہ نکلا پڑتا تھا۔ اس کی موت کا خیال ایک بجلی تھی جو سر سے پاؤں تک ایک عجیب حالت پیدا کر دیتی تھی۔ چونک پڑتی تھی اور آہستہ سے اس کے منہ پر ہاتھ پھر کر ٹھنڈا اسانس بھر لیتی تھی۔ شاہد ان ہی خیالات میں منہمک اور افکار میں مستغرق تھی کہ مسجد سے صدائے توحید بلند ہوئی۔ اور موزوں کی آذان نے رات کی خاموشی

سلسلہ توڑا۔ چاند بزم اور تارے پھیکے پر کر حیاتِ انسانی کی بے ثباتی کا درس دے رہے تھے۔ اذان سنتے ہی حسن یہ کہہ کر اٹھا :-

”حق نام تیرا“

فتح کی بتی سامنے جھلملا رہی تھی کہ شاہق کی نظر پڑی۔ اور اس نے دل میں سوچا یہ ہی کیفیتِ انسانی ہے اگر کہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ دنیا کا۔ طاقت فانی۔ باقی رہنے والی ہر تو وہی ایک ذات ہے اللہ نہ کہے وہ اور آپ ہشتہ خشت۔ یاقین پھر آنکھ کے سامنے آیا۔ بلبل اٹھی۔ یہ پہلا روز بلکہ پہلا انعام تھا کہ شاہق نے زبردست طانت کا اعتراف کیا۔ اور فوراً تصدیر کیا کہ عاجزی کا سر اس کے حضور میں جھکا کر بچہ کی سلامتی کیواسطے التجا کروں۔ اٹھی وضو کیا نماز کو کھڑی ہوئی تھی۔ اور اگر نماز ہو جاتی تو یہ پہلا سجدہ تھا جو ایک فرشتہ عورت کی طرف سے خدا کے حضور میں ہوتا۔ مگر بچہ کی اس آواز نے :-

”ہائے اماں میری جان نکلی۔ پریشان کر دیا۔ اور دوڑی اور یہ کہہ کر آئی۔

”میں اپنے بچے کے قربان۔“

بیہوش بچہ کا سر ماکے گود میں تھا۔ جھنجھوڑتی تھی، جگاتی تھی، چلاتی تھی۔ مگر ہر کوشش بے سود اور بیکار تھی کہ شاہد ماکے گود میں ایک ہلکی سی سبکی لیکر ختم ہو گیا۔

بچہ سوال باب

[زاہدہ کو پہاڑ سے آئے ہوئے دو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ ایک روز غلات سمول دو بچے احسان تنفکرو منوم دفتر سے آکر اپنے کمرہ میں خاموش بیٹھ گیا۔ زاہدہ اس کے اس طرح بے وقت اور چپ چاپ آنے سے پریشان ہو گئی، اور پوچھا :-]

”خیر ہے اس وقت کیسے آئے؟ جی تو اچھا ہے؟“

احسان کی آنکھوں میں آنسو ڈھبائے ہوئے تھے۔ بیوی کی صورت دیکھ کر دل بھر آیا۔ مگر ضبط کیا اور کہنے لگا۔

”خیریت کیا ہے، جو کیا اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔ دیکھئے کتنی بھگتتی پڑتی ہے۔“

زراہدہ۔ ”آخر بتاؤ تو سہی کیا ہوا، کیا کام میں کوئی غلطی ہو گئی؟“

احسان۔ ”نہیں کام میں تو غلطی نہیں ہوئی، اب زندہ۔“ غلطی کی سزا مل گئی۔

زراہدہ۔ ”سات سال تک، اور ایک مہینہ بیٹا ہوا۔“

احسان۔ ”کیا بتاؤں؟ اور کس منہ سے بتاؤں، آج افسر نے بلا کر بہت

سمت سُست کہا اور موقوف کر دیا۔ اس بکثت نے جو دہن کی حیثیت سے آئی تھی اور

جس سے نکاح کرنا زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ ہر کا دعویٰ کر دیا۔ کل مقدمہ ہے خسرِ صا

تشریف لائے تھے۔ نہ معلوم صاحب کے کان میں کیا بھرا کہ نوکری بھی گئی، رسوائی بھی

ہوئی۔ میں جب باہر نکلا ہوں تو وہ خود بھی مرتع اور بے باپ کے ساتھ بڑے نیچے کھڑی

تھی۔ ایسی غلات تہذیب باتیں کی ہیں کہ زبان سے نہیں اُٹھ سکتا۔ میں نے سب

باتوں کا جواب دیا۔ والد صاحب کھڑے سُستے اور سُستے رہے۔ سچیا آخر میں کیا کہتی ہے۔

”اب میں تمہارے نکاح میں نہیں رہنا چاہتی۔ جس قدر جلد ممکن ہو مجھ سے قطع تعلق کرو۔“

اگر تم کہو گے تو میں مہر میں سے کچھ حصہ چھوڑ دوں گی۔“

زراہدہ۔ ”تشویش کی بات ضرور ہے۔ لیکن خدا پھر بھر دسہ کرو، وہی ہر

مشکل آسان کرتا ہے۔“

آج دن کا باقی حصہ اور ساری رات گھر بھر میں پریشانی کی گزری، علی الصبح

زاہلکا ڈولی کر ایک لڑکے کو ساتھ لے ہوٹل میں پہنچی۔ بیگم صاحبہ نے اندر آنے کی اجازت

دی۔ دشمنی کی صحبت یا قہر مند بیوی۔ اور اُنکے والد ماجد کے متفقہ ہمتہ نے زاہلکا کا استقبال

کیا۔ اور حبیب زاہلکا نے لڑکے سے یہ کہلوایا کہ اگر آپ کے والد صاحب اجازت دیں تو چند لمحہ

”تنہائی میں گفتگو کرنی چاہتی ہوں، تو اس کا یہ جواب ملا ”ایسی کیا تخیل کی بات ہے، تمہارے شوہر نے جو دعا دی اس کا ثمرہ اس کو بھگتنا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ تمہاری وجہ سے اپنے والد کو باہر جانے کی تکلیف دوں۔ تم ہی جیسی جاہل کندہ ماتراش عورتوں نے عورت کے نام کو بٹہ لگایا۔ احسان یقیناً سزا کا مستحق ہے۔ اور میں ہرگز درگزر نہ کروں گی۔“

”زاہدہ۔“ وہ آپ کے شوہر ہیں۔ ایسے الفاظ استعمال نہ کیجئے۔ اگر ان سے کوئی غلطی ہوئی تو زیادہ خیال نہ کیجئے، وہ اور آپ ہمیشہ خوش رہے ہیں۔ ان کی ادب آپ کی دونوں کی ہر ممکن خدمت کو حاضر ہوں۔“

سوکن۔ ”تمہاری جہالت افسوسناک ہے! تم میرے سامنے ایسے فریبی انسان کا نام مت لو۔ وہ میرا شوہر نہیں ہے۔ ایسے دغا باز کو میرا شوہر کہنا میری توہین ہے۔ وہ تم جیسی ذلیل عورتوں کے قابل ہے۔ میں ایسے بے ایمان مفلس کا لیکر کیا کروں گی۔ اب آپ تشریف لے جائیے، مجھے کچھ ہی جانا ہے۔“

”زاہدہ۔“ میں ہر کے متعلق اس قدر عرض کرنا چاہتی ہوں۔“

سوکن۔ ”بس بس زیادہ پریشان نہ کیجئے، میں کچھ سُننا نہیں چاہتی۔“

زاہدہ آٹے پاؤں واپس ہوئی تو احسان دالان میں ٹہل رہا تھا۔ دریافت کیا

”کہ کہاں گئی تھیں؟“ گلاس نے کوئی جواب نہ دیا اور خود ہی زبان فٹ کیا کہ کچھ ہی جاؤ گے؟

احسان۔ ”جا کر کیا کروں گا! اور سب کے سامنے ذلیل و رسوا ہوں گا۔“

باوجود انتہائی کوشش کے مقدمہ اور بیماری یہ دو حلقے ایسے ہوئے کہ زلزلے

ایک لمحہ کے واسطے شمیم کو خوش نہ دیکھ سکی۔ اس واقعہ کا تیسرا ہفتہ تھا کہ دوپہر کے وقت

ایک دن میاں بیوی مالی ضروریات پر غور کر رہے تھے کہ باہر سے کسی شخص نے آواز دی۔

احسان باہر گیا تو معلوم ہوا کہ مہرجلی کی ڈگری میں گرفتاری کا وارنٹ ہے۔ احسان

نے اندر جانا چاہا تو اجازت نہ ملی اور احسان جیل خانہ پہنچ گئے۔

پچھیسوال باب

مقدمہ کی کامیابی سے خوش ہو کر زاہد کا کی سوکن نے کلب میں جلسہ کیا اور خاتمہ پر ایک مختصر تقریر میں فرمایا:-

”مردوں کو اگر ان کے اعمال کی اس طرح کافی سزا ملتی ہے تو قوم بدبخت بہت جلد اپنے تمام مقاصد میں کامیاب ہو جائے۔ نصف سے زیادہ قوم ان سنگدل افراد کی بدولت مردہ ہو چکی۔ اور اب ہم صرف اس عرض کی دعا ہیں کہ ان کے احکام کی تعمیل کریں۔ اور لونڈیوں کی طرح حکم بجا لائیں۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر اسی طرح مسلمان عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ سلوک کریں تو چند ہی روز میں مردوں کی بدسلوکی کا خاتمہ ہو جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ دغا باز احسان اس وقت

اپنے کئے کی سزا بھگت رہا ہو۔ اور حیل خانہ کی چار دیواری میں سڑ رہا ہے۔“ تقریر ختم ہوئی تو سامنے کے کوند سے ایک برقع پوش عورت اٹھی۔ اس کے کپڑے میلے تھے۔ اور بال پریشان۔ اس نے گھڑے ہو کر کہا اجازت ہو تو چند منٹ میں بھی کچھ کہوں؟ بیویاں اس کا منہ نکلتی رہیں۔ اور ایک نے کہا ”فرمائیے“ تو زاہد نے کہا:-

”آپ جیسی محترم خواتین لاریب مسلمان عورتوں کی واسطے قابلِ عزت ہیں اور نہایت مبارک ہو گا وہ وقت جب مسلمان عورتیں مردوں کی ناجائز گرفت سے آزاد ہو کر وہ حقوق حاصل کریں گی جو مذہب مقدس نے ان کو عطا فرمائے۔ مگر کیا آپ مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیں گی کہ آپ نے جو طریقہ اختیار کیا۔ اور جو زندگی آپ بسر فرما رہی ہیں یہ اسلام اور مسلمانوں کی واسطے کس حد تک قابلِ فخر ہے۔ اس سوال کا جواب عنایت فرما کر ممنون سمجھے کہ

کیا اسلام اس کا نام ہے کہ شوہر بیوی کے ہاتھوں جیل خانہ پہنچے؟
میری خرم بہن کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ کو کیا یہ علم نہ تھا کہ آپ جس شخص
سے نکاح کر رہی ہیں یہ دوسری بیوی کا شوہر بھی ہے؟ کیا آپ کا اسلام ہی
تھا کہ اپنی ایک بہن کے تمام حقوق یا مال فرما دیجئے؟ اگر نکاح ثانی اس کا
شرعی حق تھا تو شکایت کیسی؟ اور نہ تھا تو آپ اس کی مرتکب کیوں ہوئیں؟
کیا شرافت کا تقاضا یہی ہو کہ کل آپ جس کی بیوی تھیں۔ وہ آپ کے مہر محل
کی بدولت آج جیل خانہ جائے۔ اور آپ خوش ہوں؟ کیا انسانیت کے یہی معنی
ہیں کہ جب تک اس کو دوسری بیوی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا قسم تھا آپاں سکی
تھیں۔ اور جب اُس نے آپ کی ایک بہن کو آپ کی ایک جنس اور اپنی بیوی کے
حقوق پر توجہ کی تو آپ اس کی دشمن ہو گئیں؟

بیوی اس بد بخت قیدی کی منکوحہ میں ہوں اور جیسا کہ میں کر چکی ہوں اب
بھی اس کے واسطے آمادہ ہوں کہ میں اور میرے بچے آپ کی خدمت میں لوٹتی
علاموں کی طرح بسر کر دیں گے۔ آپ غور فرمائیے کہ میں نے یہاں سے ہر ماہ آپ کو
نصف تنخواہ روانہ کی۔ اور جو کچھ خدا نے دیا اس میں آپ کے حقوق کو کبھی نظر انداز
نہیں کیا۔ لیکن برخلاف اس کے آپ نے میرے ساتھ جو کچھ کیا پہاڑ کے آسمان
وزمین مرکان کے درو دیوار اور محلہ کے مرد عورت اس کے شاہد ہیں۔ آپ کو رو
وقت یاد ہو گا جب میں بے گناہ آپ کے حکم سے نکالی گئی۔ اور آپ نے مجھ پر چوٹی کا الزام
اٹھا کر روکا۔ زیور کی پوٹلی میرے صندوق سے نکلی اور سینکڑوں عورتوں مردوں
نے میرا تماشہ دیکھا! میں نے اس وقت بھی جب میری آبرو خاک میں ملی صبر کیا۔ اور
آج بھی تمہاری شکر گزار ہوں۔ آپ کے ہر میں یہ میرا زیور حاضر ہے۔ قبول
فرمائیے۔ اور بد نصیب شدہ ہر کو قید سے رہائی دلوائیے۔“

یہ کہہ کر زار اٹھا۔ نے سب بیویوں کے سامنے زیور کی صندوقچی رکھ دی تو مرجبا
مرجبا کے نعروں سے کرو گونج اٹھا۔ زار اٹھا کی آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ اور قریب
قریب تمام عورتیں سوکن پر لعن طعن کرنے میں اس کی مینوا تھیں۔ اسی وقت باضابطہ
رہبر ہر کی لکھوائی گئی۔ اور اس طرح احسان کو صبح ہی جیل خانہ سے رہائی ملی۔
احسان کے وہ انسر جنہوں نے اس کو موقوف کیا تھا۔ ان کی بیوی بھی جلسہ
میں موجود تھیں۔ انہوں نے مفصل حال ڈپٹی صاحب سے کہا اور احسان دوبارہ ملازم ہو کر
زار اٹھا کے ساتھ اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگا۔

ستائیسواں باب

شاہل کی موت کا عدم ایسا نہ تھا کہ حسن آسانی سے برداشت کر لیتا۔ لاکھ بٹھلنے
کی کوشش کرتا۔ مگر دل اندر سے ہٹھا جاتا تھا۔ کھانا پینا چھوٹ گیا۔ ہر وقت وہ تھا اور
قبرستان۔ نینا بھوک اڑ گئی۔ بچہ کے غم میں بچوں کی طرح روتا۔ ایک ایک کا منہ حسرت سے
’نکتا‘ اور کہتا ’اللہ شاہل کی صورت دکھا دو‘ طبیعت نڈھال اور داغ خواب ہو گیا۔
’قبر کو چھٹتا‘ ’تھوڑا کو پیار کرتا‘ ’دخنوں سے سر بھورتا‘ خاک کو آنکھوں سے لگانا‘ روتا‘
’بلبلانا‘ ’چیننا‘ ’پیتنا‘ ’پرندوں سے گر کر مرنے‘ ’بادلوں سے ملتی ہوتا‘ چاند سے خطاب کرتا‘
’سوچ سے سوال کرتا‘ ’دن بھر جنگل کی خاک چھانتا‘ اور رات بھر قبرستان میں داوہلا
مچاتا۔ چند روز میں ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ جس میں سوائے سانس کے کچھ نہ تھا۔
’سرخ‘ و ’سفید رنگ‘ جھلس کر سیاہ‘ اور ہاتھی جیسا ڈیل سوکھ کر کاشا ہو گیا۔

چار بائچ مہینہ اسی طرح بسر ہوئے۔ اور اب حسن کو یقین ہو گیا کہ جس خیر نے
زندگی میں میرا مال مجھ سے جدا کر دیا۔ وہ مرنے کے بعد مجھ سے ملا دیگا۔ دس ہزار
روپے کی جائداد بیوی کو دی۔ باقی تمام اثاثہ مدرسہ کے نام وقف کر دیا۔

حسن کی مصیبت سے شہر بھر کو ہمدردی تھی۔ مگر مصیبت ہی ایسی تھی جہاں سب مجبور لاچار تھے۔ اس کی صورت دیکھ کر ہر شخص کو رحم آتا، آدمی ان کا کپڑا ہے۔ غذا ہوئی بند چار پائی سے لگ گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر وقت بخار رہنے لگا۔ اب اگر آمدنی تھی تو صرف اس جائداد کی جو شاہد کے نام تھی۔ اور یہ کہنا جائز ہو گا کہ میاں سے تا امید ہو کر اور یہ سمجھ کر کہ موت تلنے والی اور صحت تلنے والی ہیں اس نے اس کے علاج پر زیادہ توجہ نہ کی۔ دیر کا وقف شاہد کے دل پر دوسرا صدمہ تھا۔ دنیا بدل گئی، اور زمانہ پلٹ گیا۔ شاہد جیسا لال گہری گویں جاسویا۔ اور حسن جیسا جوان قبر کے کنارے جا پہنچا۔ مگر نہ فرق آیا تو شاہد کے ڈھنگوں اور ویدوں میں۔ وہی کلب کے جلسے، وہی ترقی کی دھن، اور وہی مذہب نفرت۔ حد یہ ہے کہ میاں کے مرض الموت میں بھی اس کی تفریح مانگنے ہوئی۔ گھنٹوں حسن اکیلا پڑا رہتا، اور کوئی اتنا تک بیٹھ نہ سکتا کہ حلق میں پانی پڑے۔ دوائی ٹھنڈائی تو تھی ہی نہیں۔ اور تھا بھی کون جو علاج کرنا۔ لے دیکر ایک بیوی ہی بیوی اس کا بس چلتا تو شاید دو چار سانس پہلے ہی میاں کو پہنچا دیتی۔ علاج، غذا، تسکین جو کچھ تھا وہ پانی۔ اس کے بھی لاسے پڑ گئے۔ جب بخار نے کسی طرح سچھا نہ چھوڑا تو حسن کی زندگی شاہد کو وبال جان ہو گئی۔ مجبوراً ہی گھر آ جاتی ورنہ زیادہ وقت کلب میں گزار دیتی۔ دوست آشنا، جان پیچھاں اتے اور دیکھ دیکھ کر ہمت پکڑتے۔ حالت ردی ہوتے ہوئے یہاں تک پہنچی کہ ایک رات بالکل بہہ پیش پڑا رہا۔ شاہد نے سرشام کیفیت دیکھ لی تھی۔ مگر پڑ کر جو ڈھیر ہوئی تو آنکھ صبح ہی کو کھلی۔ پاس آئی دیکھا، پوچھا، مگر جواب نہ ملا۔ تو اخبار دیکھنے چلی گئی۔ دنل نیچے کے بعد آئی تو معلوم ہوا کہ حسن کی روح کبھی کی دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔

اٹھائیسواں باب

حسن کی موت پر عدت وغیرہ تو جاہلوں کا کام تھا۔ اس لئے شاہکی نے جائز رکھی ہی نہیں۔ غضب یہ کیا کہ نماز روزہ کے گہید، یتیموں کو کھانا، اور مسکینوں کی خیرات بھی فضول سمجھ کر اڑا دی۔ آمدنی میں کمی وقف کے بعد ہی شروع ہو گئی تھی۔ مگر دل بڑھا ہوا، احوال چڑھے ہوئے۔ سینکڑوں روپے کے مقابلہ میں اب ساڑھے ستر روپے ماہوار حقیقت ہی کیا رکھتے تھے۔ جائداد بکتی شروع ہوئی۔ باپ نے ہر چند سمجھایا، ماں نے بہتیرے نشیب و فراز دکھائے۔ مگر انھن کا سالانہ جلسہ مدراس کا تھا۔ شرکت لازمی اور جانا ضرور۔ جوڑے اور گریہ اور وہ عرض دو ہزار روپے کو ایک مکان فروخت ہوا۔ قصہ کوتاہ ایک پانچ سال میں ساری جمع پونجی خالص لگ گئی۔ اس وقت پھر ایک دفعہ باپ نے اور ماں نے بہنوئی نے، اور بہن نے کہا کہ ”روٹی تم کو اوتھنا کر کتوں کو، یہاں کیلی پڑی ہو، ہمارے ہاں آؤ۔ جو دال دلیا اللہ نے دیا ہے کھاؤ۔ اور خدا کا شکر کرو۔“ مگر خدا معلوم جھوٹی غیرت تھی، یا روکھی پھکی ٹمکنٹ۔ منافرت کا اثر تھا یا تہذیب جدید کا خبط کہ ماں نے منتیں کیں۔ باپ نے خوشامد کی، بہنوئی نے سمجھایا، اور بہن نے ناک رگڑی، مگر اس نے منظور نہ کیا۔

بچہ کا دبا کا کچھ کم نہ تھا۔ اس پر افلاس کی مصیبت اور اتنی سنگین کہ جو ہاتھ بھر مٹھی روپے اور اثرفیاں لٹاتے تھے، وہ اب ایک ایک روپے کو ترسنے لگے۔ ماں میں کم نوصن کی زندگی ہی میں ہو چکی تھیں۔ ایک البتہ اپنے دم کی تھی۔ اب اس کو بھی الگ کرنا پڑا۔ افلاک بات ایسے نہ تھے کہ شاہکی کا پیچھا چھوڑ دینے۔ گھنڈوں بیٹی اپنی حالت پر غور کرتی اور روتی جن کا ہر وقت سسٹر سسٹر کہتے منہ خشک ہوتا تھا وہ اب اگر جھانکتی بھی نہ تھیں۔ دن دن کدھی لگائے کیلی ٹروں ٹوں پڑی رہتی۔ باپ کی مرضی اور ماں کی مانتا تھی۔ وہ دونوں وقت

کھانا بچھڑیتے۔ مگر اچھے پاؤں تھک چکے اور صحت بگڑ چکی تھی۔ شکل سے ایک آدمی نالہ کھا سکتی۔
اب البتہ شاہد کی کو معلوم ہوا کہ کیا کیا اور کیا کر چلی۔ دُور کے دُھول سہاؤ نے
جدت فقط ظاہری۔ ٹیپ ٹیپ کی دُہن تھی۔ جس کا باطن زہر آلود اور سم قاتل مگر کیا
کر سکتی تھی۔ دقت بھل چکا۔ سب سے بڑی چیز ندامت تھی۔ جو ہر وقت سر پر سوار
تھی۔ افکار کا جوم۔ آلام کی بھرمار۔ بخار شروع ہوا۔ باپ نے تو کچھ نہ کیا۔ مگر ابا نے
ایک دفعہ اور کوشش کی کہ ساتھ لیجاؤں۔ لیکن ناکام رہی۔ انکار رہے سوار۔ بخار دم کیا۔
اور ایک پندرہ ہی دن میں فیل کا فیل شاہد کو کھچوٹی ہو گئی۔ مرے کو مارے
شاہ مدار سپٹ میں ایک درو ایسا اُٹھتا تھا کہ پھل کی طرح تر پڑتی تھی۔ باپ نے میوں
کو دکھایا سب نے رائے دی اندر پھوڑا ہے۔ علاج ہر چند ہوئے۔ مگر فائدہ کی کوئی
صورت نہ نکلی تو ایک روز ابا نے اس سے کہا۔

”بیٹی زندگی کا پہلا حصہ ختم کے قریب اور دوسرا شروع ہونے والا ہے۔

ختم ہونے والا فانی اور شروع ہونے والا ابدی ہے۔ یہ شے والا اور
وہ رہنے والا۔ یہاں سکھ عارضی، اور دُکھ چند روزہ ہے۔ وہاں کے
ثواب مستقل، اور عذاب اُٹل ہیں۔ یہ سوانگ دیکھ لیا۔ اب وہ رنگ بچنا
پڑے گا۔ یہ نئی جگہ اور غیر لوگ تھے، وہ انوکھی جگہ ہے، نہ اجنبی مقام۔
دیکھا بچا لا گھر جانے بوجھے لوگ، ملنے کو کئی پہاڑی کھیتی تیار اور چٹا چٹایا
گھر موجود۔ اب تک کے خیالات سخت دعوئے شدید اور رائیں مضبوط تھیں۔

مگر آج وقت ہے کہ طبیعت پر زور دے اور ایمان سے پوچھو کہ جو سفر پیش
اور جو منزل سامنے ہے اس کے واسطے ضرورت کیا ہے۔ اور کیا کیا۔
غور کرو کہ اس زندگی کی کوششیں، اور سوچو کہ یہاں کے تمام کام کس قدر
خلو پر مبنی، اور صداقت پر محمول تھے۔ اس وقت کہ اس دُنیا کے ہر

تعلق سے فراق ابدی ہو کر دہاں جاتی ہو جہاں ہمیشہ رہنا اور رہنا ٹھہرنا اور رہنا ہے۔ کس طرح چلیں اور کیونکر رخصت ہوئیں۔ آگے کیا بھیجا اور پیچھے کیا چھوڑا؟ ساتھ کیا لیا اور پاس کیا رکھا۔ کتنا نازک ہے یہ وقت اور عبرت انگیز یہ سال کہ مجھ کرموں جلی ما اور بد نصیب باپ کے سوا اس عورت کی میت پر جو چالیس برس دنیا میں رہی۔ کوئی دوا نسوگر کرنے وار نہ ہوا اور ظہار ملاں محض اخباروں تک محدود رہے۔ زبان دنیا بھر کے جن کاموں میں گرفتار رہی، دماغ زندگی کے جن جھگڑوں میں الجھا رہا، اس وقت وہی تصویریں آنکھ کے سامنے ہیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ زبان کلمہ توحید ادا کرتی اور دماغ مالک حقیقی کے خوف سے تھرا اٹھتا۔ پٹی کے ارد گرد مسلمان عورتیں کلام پاک کی صدائوں میں جو قدامت کا جو سر تھا، تم کو دنیا سے وداع کرتیں اور بجائے کہا روں کے کندھوں اور گاڑی کی چھتوں کے مسلمان شہنشاہ حقیقی کا فرمان پڑھتے ہوئے اپنے پاک کندھوں پر یادِ ضو تنہا راجا زہ لجاتے۔ آج جدتِ تم کو ان سب چیزوں سے محروم کرتی ہے۔ مگر اس لئے کہ ابھی دماغ صحیح اور زبان کام کے قابل ہے۔ بیٹی سمجھاتی ہوں کہ افلاس کی مصیبتیں، جدائی کے صدمے اور ناکامی کے بچ، اس باز پرس کے مقابلہ میں کچھ نہیں۔ توبہ کرو، معافی مانگو، روؤ اور گرہ گڑاؤ۔ رحیم ہے کویم ہے۔ شاہد کلمہ پڑھ اور کہہ:-

”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ“

دنیا آج ختم ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ ہی یہاں کی امنگیں اور حسرتیں بھی۔ اب معاملہ اس سے ہے جو حقیقی حاکم اور سچا مالک۔ جہاں پہل پہل کا حساب اور تہل تہل کا مواخذہ۔ ہاتھ اٹھا، ان ہاتھوں کو جوڑ، یہ وقت آخری سانس مہان، اُد دنیا ختم ہے۔ گواہ کر مجھ کو اپنے اسلام کا اور اقرار کر باپ کے سامنے توحید کا، پناہ

انگ اُس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر اور بیج اُس روز کے عذاب سے
 جسکی شام نہیں۔ ما اور باپ جو عاشق زار تھے دونوں چھوٹے ہیں۔ اور دنیا اور زندگی
 جسکی دیوانی رہی آنکھ سے اوجھل ہوئے ہیں۔ ابھی وقت باقی اور موقعہ موجود ہے۔
 ماں پہاں تک پہنچی تھی کہ شاہکار پر زنت طاری ہوگئی۔ اس نے مالی کی طرف ہاتھ چڑھا کر
 "ہاں موت میرے سر پر آ پہنچی۔ اور جس چیز کو میں عمر بھر بھولتی رہی اب اس سے
 چھٹکارا نہیں۔ اس وقت بھی کہ اذیت کے مارے جان نکل رہی ہے اور تکلیف لے
 جان پر بنا رکھی ہے۔ جہاں اپنی بہت سی غلطیوں پر نادم ہوں وہاں نہایت اذیت
 عرض کر دینی کہ مجھے اب بھی آپ کی بعض باتوں سے اتفاق نہیں ہے۔ دنیا اچھے
 اور بُرے، فریبہ دار اور گنہگار بندوں سے بھری پڑی ہے۔ اس دنیائے مجھ سے
 بھی زیادہ گنہگار عورتوں کو دھکے دیکر نکالا ہے۔ بیشک میں رو سنا ہوں اور
 زندگی بُرائیوں سے تھری ہوئی ہو۔ لیکن خدا نے اپنے رحم و کرم سے بڑے بڑے
 سرکشوں کا بیڑا پار کیا ہے۔ اسی کے فضل کی توقع مجھے بھی ہے۔ آپ کے خیالات
 آپکی زندگی آپ کی تلقین امت مرحومہ کے لئے بہت کچھ مفید اور میں خدا کو شاہد
 کرتے ہوئے کہتی ہوں کہ آپ کا وجود اگر مسلمانوں کے واسطے نہیں تو اسلام
 کے واسطے بسا غنیمت ہے۔ لیکن وہی خدا جسکو میں گواہ کر رہی ہوں اچھی طرح
 جانتا ہے کہ میں اس وقت بھی اس رائے پر صداقت سے قائم ہوں کہ قدامت
 دورِ حاضرہ میں اصلاح کی محتاج ہے۔ اور اگر آپ جیسی محترم خواتین اس طرف توجہ
 فرما کر قدامت اور جدت کو گلے ملادیں تو قوم اور مذہب دونوں پر ایک بڑا احسان
 ہوگا۔ انا جان ابا وجود ان تمام عیوب کے جو جدت میں موجود ہیں یہ بلا ٹھننے والی نہیں۔ اور
 مسلمانوں کے واسطے سوا اسکے کوئی چارہ نہیں ہو کہ وہ وقت کا ساتھ دیں۔ اور اپنی آبائی جوہر
 جنکو مجھ بد نصیب نے ہمیشہ ٹھکرایا محفوظ رکھیں۔ اور مذہب کو اپنا جزو عظم قرار دیں۔

میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرے بعد دنیا کی ہر خوشی اور زندگی کی ہر مسرت
 کچھ زخم پر کچھ سکے ہوگی۔ اور میری موت آپ کی زندگی کو مردہ کر دیگی لیکن میں
 آپ سے التجا کرتی ہوں کہ جو کچھ میں چھوڑ رہی ہوں اس میں نصف مدرسہ کے
 واسطے وقف ہو۔ آپ کو شمش فرمائیے کہ ہمارے مدرسہ سے ایسی لڑکیاں نکلیں جو
 سمجھتی ہوئی قدامت کے نمونے ہوں اور اسلام کی برکتیں انکے ہر قول و فعل سے ظاہر ہو
 کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد شاہنہا نے پھر کہنا شروع کیا :-

”آپ نے مجھے یسین سنائی مگر میری روح اس وقت تک پرواز نہ
 کرے گی۔ جب تک میں اپنے جرائم کی سزا کا پورا مقابلہ نہ کروں۔ اور
 جب تک دنیا کے طاقتور اچھی طرح نہ دیکھ لیں کہ کمزوروں پرستم توڑنے
 والے ظالم کو کس طرح موت آتی ہے۔ میں اب بھی یہ کہتی ہوں کہ مجھے
 حقوق اللہ کا زیادہ اندیشہ نہیں ہے۔ ہاں خدا کی کمزوروں کا چار مخلوق
 جو میرے ہاتھوں تاراج و تباہ ہوئی۔ یقیناً مجھ سے بدلہ لے گی۔ اور
 لے رہی ہے۔ اگر آپ کو مجھ سے سچی ہمدردی ہے تو منبراً اور رحیماً
 کو بلائیے۔ میں ان سے اپنے مظالم کی معافی مانگوں اور نفعیہ نصیب و وقف
 ان کی خدمت میں پیش کروں کہ ان کی دعائیں میری اُوبت کا خاتمہ کریں.....
 اما جان اِخبار اجلہ ہی کیجئے۔ میرا دم نکلتا ہے۔ اور رکتا ہے ایک
 تکلیف ہو تو کہوں۔ یہ جیم جیتے ہی جی آگ میں بھن رہا ہے عقل اسکو
 بخار کہہ کر مٹھن ہو جائے۔ مذہب اس کو عذاب بنا بیگا۔ درد اور کسک
 کی موجیں ہیں کہ بدن کے ہر حصہ سے اُمنڈ رہی ہیں۔ ہائے کیا کروں“
 شاہنہا اسی طرح تڑپ رہی تھی کہ زاہد رحیماً اور منبراً کو لیکر اندر داخل
 ہوئی۔ انکی صیرت دیکھتے ہی ماں ہاتھ جوڑتی ہوئی اٹھی تو رحیماً نے رو کر کہا :-

”بیگم مجھے کیوں گنہگار کرتی ہو۔“ باب نے پھر ہاتھ جوڑے اور کہا:۔
 ”زندگی کی نخت اور خودداری کے جھوٹے ٹکھنڈے جو اچھل کی لڑکیوں کا
 شیوہ ہو گیا ہے۔ بد نصیب شاہک کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے۔ اور اس نے
 وہ حرکتیں کیں جو موت کے دروازے پر قصر زندگی کے بسنے والوں کے واسطے
 سبق ہیں۔ میں تم سے اور بولا منیر آستہ بہشت التجا کرتی ہوں کہ اس کا قصور
 معاف کر دو۔ اپنی غلطیوں کی پاداش میں یہ اپنی آدھی جاتاؤ تمہاری خدمت
 میں پیش کرتی ہے۔ یہ دستاویز قبول کرو۔ اور دعا کرو کہ خدا نے وحی لا بشریٰ
 اس پر رحم کرے۔ موت کی سختی اور قہر کا عذاب اس پر آسان ہو۔ اور قیامت
 کے مواخذہ سے محفوظ رہے۔“

اس وقت شاہک نے دونوں کے آگے ہاتھ جوڑے۔ اس کی روتی ہوئی
 آنکھیں نہایت سے جھکیں اور اتنا کہہ سکی:۔
 ”خدا را میری خطا سے درگزر کیجئے“

رجیمؔ کی بھی پچی بندھ گئی تھی۔ اُس نے شاہک کے سر پر ہاتھ پھیر کر
 کہا:۔

”بیگم خدا تمہاری مانتا ٹھنڈی رکھے۔ اور شاہک بیوی کی غریب برکت دے۔
 مجھے زاہدؔ بیوی رستہ بھر ہی سمجھاتی لاتی ہیں۔ میں اس وقت پرانے جھکڑے نہیں
 چھڑتی۔ میں نے دل و جان سے معاف کیا۔ خدا معاف کرے۔“

اتنا سنتے ہی شاہک کے منہ کی زردی اطمینان کی ایک خفیف سی
 سرخی میں تبدیل ہوئی۔ اُس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے۔ اور دل ہی
 دل میں جو کچھ کہا وہ صرف ہنٹوں کی حرکت سے ظاہر ہوا مگر الفاظ سمجھ میں نہ آ سکے۔
 اب شاہک کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کر بالکل خاموش ہو گئی۔ پھر زاہدؔ کو

اشارے سے قریب بلایا، گلے سے لگایا، اور آہستہ سے کہا:-

”میرا یہ پیام مسلمان لڑکیوں تک پہنچا دیتا رہ۔“

”تعلیم جدید کے جذبے نے میری دنیا اور زندگی کو برباد کر دیا، ضرورت تھی کہ دنیا میرے واسطے جنت اور زندگی دوسرے کیواسطے راحت ہوتی، مگر میرے یہ دونوں جوہر غارت ہو گئے۔“

اب میری دنیا ختم ہو رہی ہے اور اصلاح اہل احتیاط تو درکنار وہ وقت ہے کہ چپتا

بھی نہیں سکتی۔ افسوس بات نہیں کہچاتی..... ہر وہ چیز جسے اپنا سچا دشمن ہی سمجھتا ہے

آنکھیں بدل گئی۔ یہاں تک کہ جلد فاک کے اعضا بھی بے وفائی کر رہے ہیں۔ اور سب نے چھوڑ

منہ موڑ لیا..... تم مسلمان لڑکیوں کو یہ الفاظ پہنچا دینے کی ذمہ دار ہو کہ مسلمان

لڑکیاں اگر دنیا میں کامیاب ہو سکتی ہیں تو صرف مذہب کے سایہ میں جس گھر نے جس

لڑکی نے مذہب کو ٹھکرایا وہ بادر کے کہ دنیا اس کو کہنے کی موت مارے گی.....

ہائے زار کیا کروں باتنا نہیں کی جاتی.....

اس کے بعد رک رک کر شاہکار کچھ اور باتیں جو اچھی طرح سمجھ میں نہ آ سکتی تھیں

تھیں کر رہی تھی کہ روز روشن کی وداع کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئی۔

ختم شد

اطلاع و انتباہ جوہر قدامت ۱۹۱۷ء کی تصنیف ہے اور ہزاروں
نقادین کی مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ جنوری ۱۹۳۷ء
میں حضرت مصنف مرحوم نے اس پر نظر ثانی فرمائی تھی۔ جوہر قدامت کا اداسی حق اشاعت محفوظ
کوئی عاصب اسے یا اسکے کسی حصہ کو چھاپے اور شائع کرے گا قصہ نہ فرمائیں۔ ورنہ اخلاقی ہی نہیں
قانونی جرم کے بھی مرتکب بنے گا۔ اور نہ ہی بہت بُرا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

رازق الخیری دفتر عصمت دہلی

مصوّرِ غم

مصوّرِ غم حضرت علامہ مولانا بشیر الحق (رحمۃ اللہ علیہ) کوٹ کر وٹ جنت نصیب کرے)
 شاہجہان آباد کے اُس مفتقدار و ممتاز خاندان کے فرزندِ شریف تھے جسے خاندان شاہان مغلیہ
 کے مشاہد ہونے کا نسلاً بنی نسلاً فخر حاصل رہا۔ جس نے مولوی عبدالحق صاحب مرحوم مولوی
 عبدالمقاسد صاحب مرحوم اور ہندوستان کے مشہور سحرالبیان مولوی عبدالرب خفوری بانی
 جامع مسجد سہارنپور جیسے جیسے علما و اوز قرآن و حدیث کے نامور ماہرین پیدا کئے۔ یہ آج کے دیا کا
 وہ امور خاندان تھا جس کی بیٹیاں حافظہ حاجیہ - قاریہ ام عطیہ النساء مرحومہ (چھوٹی اُستانی جی)
 اور حاجیہ ام ذکیہ - مرحومہ جیسے مشہور عالمہ فاضلہ خواتین اور جس کے داماد تینوں علما مولوی
 نذیر احمد مرحوم جیسے نامور بزرگ تھے حضرت علامہ مخدوم مقام دہلی جنوری ۱۳۷۵ء میں پیدا
 ہوئے اور ابھی نو دس برس ہی کے تھے کہ ان کے والد ماجد مولوی حافظ عبدالحق صاحب
 نے حیدرآباد دکن میں جہاں وہ محکمہ بندوبست میں افسر علی تھے انتقال فرمایا۔ اور حضرت علامہ مرحوم
 کی تعلیم دہلی میں ان کے دادا اور چچا حضرت مولوی عبدالمقاسد صاحب مرحوم اور خانبہار مولوی
 عبدالحق صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر کی نگہداری میں ہونے لگی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم کو مسلمان کفر سمجھ رہے تھے۔ اس لئے حضرت علامہ مخدوم
 نے اردو فارسی عربی وغیرہ گھر پر پڑھی۔ پھر انگریزی تعلیم دہلی کے عربک اسکول میں ہوئی۔ مگر انھوں
 نے اپنے شوق سے اسے بہت کچھ ترقی دی۔ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم (جو علامہ مرحوم کے
 حقیقی چچا تھے) اور مولانا محالی مرحوم کی شاگردی نے علامہ مخدوم کی قابلیت کی ترقی میں چار چاند
 لگا دیے اور ابھی حضرت علامہ انٹرنس ہی میں تھے کہ ان کی ذہانت کا چرچا ہونے لگا۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد مولوی عبدالحق صاحب بانی جامع مسجد بھجور کی اکلوتی صاحبزادی
 سے جنوری ۱۳۷۶ء میں شادی ہوئی اور ملازمہ میں محکمہ بندوبست کے انگریزی دفتر میں ملازمت
 شروع کی۔ مگر ملازمت کی پابندی حضرت علامہ کی طبیعت کے خلاف تھی اور دفتر کے خشک
 کاموں میں جی نہ لگتا تھا۔ پھر علامہ مرحوم کی والدہ مرحومہ اپنے اکلوتے بیٹے کی جدائی زیادہ روز
 کے لئے نگہداشت کر سکتی تھیں ان وجہ سے جم کر ایک جگہ نوکری نہ کی۔ اور ترقی کے نہایت معقول مواقع
 میسر نہ ہونے پر ان کی طرف سے مطلق توجہ نہ فرمائی۔ اور مائیں پوری۔ میرٹھ۔ علی گڑھ۔ دہرہ دوں

۲ کی تبدیلی ہوتی رہی آخر دہائی کے پوسٹل آرڈر آفس میں تبدیل ہو گئے۔ مگر چند سال گزر رہے تھے کہ ۱۹۱۶ء میں اٹھارہ انیس سال کی ملازمت سے استعفا دے دیا۔

حضرت علامہ راسخدا خیری رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے پہلی تصنیف ”حیات صالحہ“ یا ”صالحات“ ہے جو ۱۸۹۵ء میں لکھی گئی۔ ۱۸۹۸ء میں دوسری تصنیف ”منازل السائر“ ختم کی۔ ان دونوں مصاحف نادول کی اشاعت کے بعد حضرت علامہ مغفور کا شہرہ ایک مقبول پایہ تصنیف کی حیثیت سے بلند ہونا شروع ہوا۔ ۱۹۰۷ء سے رسالہ ”مخزن“ میں افسانے اور مضامین شائع ہونے لگے۔ پھر ”صحیح زندگی“ شائع ہوئی۔ اور دہائی کے باکمال ادیب کی طرز تحریر کی دلاویزی زبان کی شیرینی اور واقعات کے پیرایہ بیان کی دروگاہی کی دھوم مچنے لگی۔ ۱۹۰۸ء میں رسالہ عصمت جاری کیا۔ جو ۳۰ سال سے برابر شائع ہو رہا ہے اور ہندوستان کا بہترین زمانہ پرچہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں حقوق نسواں کی حمایت میں رسالہ ”تمذّن“ جاری کیا۔ جو پانچ سال تک بڑی خوبی کے ساتھ اپنے قرائن انجام دیتا رہا۔ ۱۹۱۳ء میں اخبار ”سبیل“ جاری فرمایا۔ مگر ۱۹۱۷ء میں دفتر عصمت میں قیامت کی آگ لگ گئی۔ اور سبیل جاری نہ رہ سکا۔ ۱۹۱۶ء میں ”شام زندگی“ شائع ہوئی اور اسے وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ پہلے ہی سال میں تین مرتبہ چھپی۔ اس کتاب نے قوم سے حضرت علامہ مغفور کو مصور غم کا خطاب دلوا دیا۔ اب اردو کے بے مثل مصنف نے تصانیف کا ڈھیر لگا دیا۔ اور درجن کے قریب ضخیم کتابیں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۲ء تک کے زمانہ میں لکھ ڈالیں۔ جو مختلف حضرات نے لکھائیں اور بقول ایک ادیب ”لاکھوں روپیہ پیدا کیا“ حضرت مصور غم نے اپنی تصانیف کی جو مقبولیت دیکھی شاید اردو کے کسی مصنف کو دیکھی نصیب نہ ہوئی۔ ایک دو نہیں درجنوں کتابیں آٹھ آٹھ دس دس سال کے عرصہ میں دس دس بارہ دفعہ چھپیں۔ بلکہ ”صحیح زندگی“ ”شام زندگی“ وغیرہ کے نو پندرہ پندرہ میں ہیں ایڈیشن شائع ہوئے۔ آخری دو کتابیں ”آئینہ کمال“ ”سیدہ کمال“ بھی چار ساڑھے چار سال میں ہزار ہا کی تعداد میں پانچ دفعہ چھپ کر ہاتھوں ہاتھ چل گئیں۔

۱۹۱۵ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اردو کو جس علامہ مغفور سے صحیح کرائے۔ ۱۹۲۰ء میں شیل یونیورسٹی نے سب سے پہلا اردو محقق مقرر کیا۔ ۱۹۲۲ء میں حکومت ہند و ڈیپ نے شمالی ہند سے بحیثیت ارا اردو کے اردو ہندی کی ترقی کے سلسلہ میں حضرت مرحوم سے پیش بہا مشورے لئے۔

۱۹۲۲ء میں سلطان کچویں کے لئے تربیت گاہ بنات قائم کی جس سے ہندوستان کے مختلف حصوں کی سینکڑوں خوشحال اور یتیم نادار بچوں نے بحیثیت بورڈز تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اور جس سے ہزاروں غریب کم استطاعت بچیاں زبور تعلیم سے آراستہ ہوئیں۔ اس مدرسہ کے لئے بیگم حاجہ عمر تہ کے

شرفیہ سیکمات کے لیے اعلیٰ
 حکمائے بکارت کی کتاب

اردو کی تالیفیں ہندوستان کے ہر حصہ میں
 صدیوں سے لکھی گئی ہیں، مگر ان کی کاپیاں
 اور نسخے اب تک کتاب خانوں میں محفوظ نہ
 تھے۔

Donated by Rehana Masib
 Collection

شرفیہ سیکمات کے لیے اعلیٰ
 حکمائے بکارت کی کتاب

تیسرا حصہ فخر نسوان بہت مختصر ہے
 مگر اس میں بھی بہت سی چیزیں لکھی
 ہیں۔

شرفیہ سیکمات کے لیے اعلیٰ
 حکمائے بکارت کی کتاب

اردو کی تالیفیں ہندوستان کے ہر حصہ میں
 صدیوں سے لکھی گئی ہیں، مگر ان کی کاپیاں
 اور نسخے اب تک کتاب خانوں میں محفوظ نہ
 تھے۔

AUTHOR د. الشاذلي الخيري
TITLE حديث قدامت

Date	No.	Date	No.
T27.1201		T11.02.08	
1629		SA-7512	
✓		T080708	



MAULANA AZAD LIBRARY
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

RULES:—

1. The book must be returned on the date stamped above.
2. A fine of Re. 1-00 per volume per day shall be charged for text-books and 10 Paise per volume per day for general books kept over - due.

